رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۰۰

جلد ۵۹ عدد ۶ — مارچ ۱۹۶۳ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے — قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۶	مارچ ۱۹۶۳ء	جلد ۵۹

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن

اچھرہ - لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

جس طرح خس و خاشاک کی خفیف سے خفیف حرکت کو دیکھ کر ہوا کے رُخ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح زندگی کے معمولی واقعات کا مطالعہ و مشاہدہ ہمیں صحیح صورتِ حال سے آگاہ کرنے میں مدد دیتا ہے۔ کسی فرد یا قوم کے مزاج کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اُس کی زندگی کے غیر معمولی واقعات پر ہی غور کیا جائے بلکہ بسا اوقات حیاتِ انسانی کے غیر اہم گوشے حقیقت کو بے نقاب کرنے میں بہت بڑی مدد دیتے ہیں۔ بلکہ اب تو ماہرینِ نفسیات نے بڑے ٹھوس اور واضح دلائل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسانی زندگی خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اُس کو صحیح طور پر جانچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی توجہ صرف اُن افعال و اعمال کے غور و فکر پر صرف کریں جو کسی انسان یا قوم سے غیر ارادی طور پر سرزد ہوتے ہیں اور جن کے سوتے شعور سے نہیں بلکہ لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں سے اُبلتے ہیں۔

آپ اگر اس نقطۂ نظر سے قوم اور اس کے اصحابِ اختیار کی حرکات و سکنات اور اُن کی نجی اور بے تکلفانہ گفتگوؤں کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حمیت نام ہے جس کا وہ اب پاکستان کی سرزمین میں دم توڑ رہی ہے۔ یہاں سے ہزاروں افراد ہر سال بھارت جاتے ہیں، وہاں کی لچر فلمیں دیکھتے ہیں اور اُن لوگوں کی مہمان نوازی سے سرفراز ہوتے ہیں جن کے قبضے میں ابھی تک ہماری ملت کی لاتعداد بیٹیاں نہایت ہی

کس مپرسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ ان زندہ درگور لاشوں پر جو کچھ بیت رہی ہے اُس کے تصور سے ہی جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن ان بھارت یاترا کرنے والوں کو کبھی اس امر کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں جس کے ہاں عفت و عصمت کی کبھی بڑی قدر تھی اور مظلوم بہن کی ایک چیخ سے ایوانِ حکومت کے در و بام ہل جایا کرتے تھے اور فرمانروا سے لیکر ملت کا ایک ادنیٰ سے ادنیٰ فرد اُس کی دادرسی کے لیے دیوانہ وار آگے بڑھتا تھا۔ دُور نہ جائیے خود اسی نیم براعظم کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ محمد بن قاسم اور اس کے رفقاء کار کو اس سرزمین کی طرف ملت کی چند بیٹیوں کے نالہ و فریاد نے ہی آنے پر مجبور کیا اور انہوں نے اُس وقت تک چین نہ لیا جب تک کہ ظالموں کے پنجۂ استبداد سے انہیں رہائی نہ دلا دی۔ مگر آج خدا جانے ہماری غیرت کو کیا ہو گیا ہے۔

یہ بے حسی ملک کے جس طبقے میں بھی ہو بہرحال کسی ملت کے لیے کوئی نیک فال نہیں ہوتی لیکن برسرِ اقتدار گروہ کی بے حمیتی پوری قوم کو رسوا اور ذلیل کر کے رکھ دیتی ہے۔ ہمارے ملک کا برسرِ اقتدار طبقہ آئے دن جس قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکات کرتا رہتا ہے اُس سے نہ صرف اُس کے صحیح مزاج کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ قومی وقار کو بھی شدید نقصان پہنچتا ہے۔ ایک مسلمان قوم کے لیے ماہ صیام جس عزت و احترام کا حامل ہے اُسے پوری دنیا جانتی ہے لیکن حکومت کے ایوانوں میں اس مقدس مہینہ کی تقدیس کو جس انداز سے پامال کیا جاتا رہا اُس کا اندازہ کرنے کے لیے کسی غیر معمولی چھان بین یا تجسس کی ضرورت نہیں آپ صرف اُن خبروں پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال لیں جو محکمہ تعلقاتِ عامہ کی چھلنی میں سے چھن چھن کر اخبارات کی زینت بن چکی ہیں۔

اسی سلسلہ کی ایک خبر یہ ہے کہ جب سردار سورن سنگھ بھارتی وفد کے قائد کی

حیثیت سے ہوائی جہاز سے نیچے اُترے تو پاکستان کے وزیرِ خارجہ نے اُن کی خدمت میں شربت کا ایک گلاس پیش کیا۔ اس پر سردار صاحب نے برجستہ کہا " میں نے جس ملک کی سرزمین میں قدم رکھا ہے اُس میں آج کل ماہ رمضان کی وجہ سے دن کے وقت کھانا پینا ناجائز ہے۔ اس لیے یہ مناسب نہیں کہ میں عوام کے جذبات اور احساسات کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ جسارت کروں " سردار صاحب کے یہ الفاظ سن کر بھٹو صاحب کو اپنی اس حرکت پر سخت نادم ہونا چاہیے تھا لیکن اُن پر کوئی اثر نہ ہوا اور انہوں نے پھر بڑے اصرار کے ساتھ اس گلاس کو اُن کی خدمت میں پیش کیا۔

قومی زندگی میں بظاہر یہ معمولی سا واقعہ ہے لیکن اس سے ہمارے اربابِ بست وکشاد کی ذہنیت کا صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سردار صاحب کے دل میں اس مبارک مہینے کے لیے کوئی جذبۂ احترام ہو یا نہ، یہ ایک الگ موضوع ہے لیکن اُن کا ایک مسلمان وزیر کو اس امر کی طرف توجہ دلانا کہ اس مہینہ میں انہیں یہ حرکت کسی صورت بھی زیب نہیں دیتی، ہمارے قومی کردار پر ایک بھرپور طنز ہے۔ ایک ایسی طنز جس کی چوٹ کو ممکن ہے بھٹو صاحب اور اُن کے ہم مشربوں نے قطعاً محسوس نہ کیا ہو لیکن اس ملک کے ہر غیرتمند شخص نے بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ یہ طنز نہیں تھی بلکہ ایک نشتر تھا جسے ہمارے دل میں چبھو کر ہمارے قومی وقار کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی اور ہمیں یہ احساس دلایا گیا کہ اب ہم دنیا کی وہ بے حس قوم بن گئے ہیں جس کے اندر کوئی قومی خودداری اور کوئی ملّی امتیاز باقی نہیں رہا۔

یہ واقعہ ہماری ملی زندگی کا کوئی ایک واقعہ نہیں بلکہ ہماری حیاتِ اجتماعی اب جس ڈگر پر چلائی جا رہی ہے اُس میں اس قسم کے واقعات معمول کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ہمارے

ہاں بڑی بے تکلفی کے ساتھ سرکاری سرپرستی میں کرکٹ میچ اور اسی طرح کے کھیل تماشے ہوتے رہتے ہیں۔ غیر ملکی مہمانوں کو بڑی آزادی کے ساتھ دعوتیں دی جاتی ہیں اور انکی طرف سے دعوت کا معمولی سے معمولی اشارہ پاکر ہم فوراً بھاگ اٹھتے ہیں جیسے کہ ہم برسوں سے اسی ایک مقصد کیلئے پا بہ رکاب تھے۔ ہمارے دماغ اب اتنے ماؤف اور ہمارے احساسات اب اتنے مردہ ہو چکے ہیں کہ ہم یہ سوچ بھی نہیں پاتے کہ ہمارے کوئی دینی شعائر بھی ہیں جن کا ادب واحترام ہمارے لئے نہایت ضروری ہے۔

آپ اگر اس افسوسناک صورتِ حال کا ذرا گہرائی میں اتر کر مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بیماری کی اصل جڑ وہ احساس کمتری ہے جو اس ملک کے مغرب زدہ طبقہ کے اندر برسوں سے پرورش پا رہا ہے۔ اس طبقہ نے مغربی تہذیب و تمدن کی آغوش میں آنکھ کھولی پھر اسی کے سایۂ عاطفت میں وہ پل کر جوان ہوا۔ اُسی کے پیش کردہ افکار و نظریات سے اس نے اپنے فکری سانچے تیار کیے، اسی سے اس نے عادات و اطوار کا درس حاصل کیا الغرض اس کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں اس نے پوری طرح پورے اخلاص اور اعتماد کے ساتھ اس سے رہنمائی حاصل نہ کی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ طبقہ معتقدات، احساسات وجذبات اور مزاج کے اعتبار سے بالکل فرنگی ہے اور اسے یہ روش اتنی عزیز ہے کہ وہ ہر وقت اس بات کے لیے کوشاں رہتا ہے کہ اس سے کبھی کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جس سے اس کی اس تہذیب کے ساتھ مخلصانہ وابستگی پر کوئی حرف آتا ہو اور کسی مغربی کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ اس میں "رجعت پسندی" کے ابھی کچھ آثار باقی ہیں۔

شعائرِ دین سے یہ بے توجہی اور مغربی اقدارِ حیات سے یہ شیفتگی صرف اس لیے ظاہر کی جاتی ہے کہ اُن کے اور ہمارے درمیان "من وتو" کے جو حجابات حائل ہیں وہ سراسر ختم ہوں اور ہم کسی طرح اپنے ان فرنگی آقاؤں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جائیں کہ یہ ملی امتیازات

جن کے وہ اکثر تذکرے سنتے رہتے ہیں اور جن کی وجہ سے وہ ہم سے بُعد اور بیگانگی محسوس کرتے ہیں، یہ صرف چند تنگ نظر اور تاریک خیال لوگوں کے بوسیدہ تصورات ہیں جن کی ہمارے ہاں اب کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ ہم درحقیقت انہی افکار و اعمال کے پرستار ہیں جو تمہارے اندر رائج ہیں۔ تمہاری تہذیب ہی ہماری تمام آرزوؤں اور تمناؤں کی مرکز و محور ہے اور اسی روشنی حاصل کرکے ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو منور کرنا چاہتے ہیں۔ "ہماری اور تمہاری جدائی" کی خبر بالکل بے بنیاد ہے بلکہ یہ ایک ہوائی ہے جسے کسی دشمن نے محض رقابت کے جذبہ میں اڑا دیا ہے۔ تمہیں ایسی خبروں پر قطعاً توجہ نہ دینی چاہیے بلکہ ہمارے ساتھ اس اندازہ سے وابستہ ہونا چاہیے۔

تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

گزشتہ دو تین ماہ سے مسئلہ کشمیر پر جس انداز سے اور جس قسم کے حالات کے تحت اینگلو امریکن بلاک کی براہِ راست نگرانی میں گفتگو ہو رہی ہے اُس پر ملک کا ہر بہی خواہ مضطرب اور پریشان نظر آتا ہے۔ یہ گفتگو نہ صرف ہمارے سیاسی تدبر کا امتحان ہے بلکہ ہمارے اخلاق کی بھی نہایت ہی کڑی آزمائش ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے رفقاء کار نے گزشتہ پندرہ سالوں میں جس قسم کی بدعہدی کی ہے اور جس اخلاقی گراوٹ کا ثبوت دیا ہے وہ تاریخ کا ایک نہایت ہی شرمناک باب ہے۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقتدار کے نشے نے ان لوگوں کو اس حد تک دیوانہ بنا دیا ہے کہ وہ اپنے اعمال کے دُنیوی اخلاقی نتائج سے یکسر غافل ہو چکے ہیں اور اس حقیقت کو بالکل فراموش کر چکے ہیں کہ قوموں کے عروج و زوال میں صرف فوج اور اسلحہ ہی فیصلہ کن قوت نہیں ہوتی بلکہ اس میں اخلاقی اقدار بھی بڑے مؤثر طریق سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر مادی قوت اور طاقت ہی تعمیر و ترقی کا واحد زینہ ہوتا تو جو قومیں ایک مرتبہ بام عروج پر پہنچ چکی تھیں انہیں

کبھی بھی آسمان پیوندِ خاک نہ کر سکتا لیکن ہمیں تاریخ میں ایسی بے شمار قوموں کے نشانات ملتے ہیں جنہوں نے ایک وقت میں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ قوت و طاقت حاصل کی۔ دوسری قوموں کو غلام بنایا اور جگہ جگہ اپنی قیادت اور سیادت کے جھنڈے گاڑے لیکن دوسرے مرحلے میں یہی قوت اُن کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی اور تاریخ کے وہ اوراق جن میں اُن کے عظیم الشان کارناموں کے قصّے سنہری حروف سے لکھے جاتے تھے ان کے اندر اُن کے تنزل اور انحطاط کی عبرتناک داستانیں بھی درج ہوئیں۔

محض طاقت جس کی پشت پر کوئی اخلاقی حس موجود نہ ہو وہ ہمیشہ ذلت اور بربادی کا پیغام ہوتی ہے اس لیے عقلمند قومیں ان دونوں کے درمیان توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ کسی قوم کی اس سے افسوسناک اخلاقی پستی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ دو قومی نظریہ کی بنیاد پر پورے ملک کی تقسیم کو قبول کرتی ہے لیکن اب کشمیر کے معاملے میں اس نظریہ کو یکسر باطل قرار دے رہی ہے۔ پھر یہی قوم تقسیم ملک کے بعد بہت سی مسلم اور غیر مسلم ریاستوں کو یہ کہہ کر ہڑپ کر جاتی ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے ساتھ الحاق کا اصل فیصلہ عوام کے ہاتھ میں ہے۔ ان ریاستوں کے باشندگان کی اکثریت چونکہ غیر مسلم ہے اس لیے انہیں لازمی طور پر ہندوستان کے ساتھ ہی وابستہ ہونا چاہیے۔ اسی اصول کے تحت منگرول، مناودر، جوناگڑھ حیدرآباد اور گوا پر دستِ ظلم دراز کیا گیا لیکن کشمیر کے معاملے میں چونکہ یہ اصول اُس کے مفاد کے خلاف پڑتا ہے اس لیے اسے غلام رکھنے کیلئے یہ کہا جاتا ہے کہ والیٔ ریاست نے اس بدنصیب خطہ کے رہنے والوں کی قسمت چونکہ ہمارے ہاتھ میں سونپ دی ہے اس لیے اس پر ہمیں پورے پورے حقوق مالکانہ حاصل ہیں۔

یہی نہیں بلکہ آغاز میں جب اس خطہ کو اپنی تحویل میں لیا گیا تو پوری دنیا کی آنکھوں میں خاک

جھونکنے کے لیے اس بات کا بار بار اعلان کیا جاتا رہا کہ ہم اس ریاست کے بارے میں کوئی جارحانہ عزائم نہیں رکھتے بلکہ صرف اس بات کے آرزو مند ہیں کہ اس پس ماندہ خطہ کے رہنے والے بغیر کسی جبر و اکراہ کے بالکل آزادی کے ساتھ خود اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں۔ ملک گیری ہمارا مقصد نہیں ہم عارضی طور پر اس ریاست کا انتظام و انصرام سنبھال رہے ہیں تاکہ ہم وہ حالات پیدا کر سکیں جن کے تحت اس مقدس مقصد کی تکمیل جلد ممکن ہو۔ اسی سلسلہ میں یو۔ این۔ او میں ایک قرارداد بھی پاس کی گئی۔ لیکن چونکہ نیت کے اندر اوّل روز ہی سے فساد موجود تھا اس لیے ایک طرف تو مختلف حیلوں اور بہانوں سے اس استصواب کو مسلسل ٹالا گیا اور دوسری طرف ایسی شرمناک تدابیر اختیار کی گئیں جن سے کشمیر کے بے بس عوام پر بھارت کا تسلط مضبوط ہوتا چلا گیا ——— کشمیر کے حقیقی رہنما اور آزادیٔ وطن کے جاں نثار جیلوں میں ٹھونس دیے گئے ان پر جھوٹے مقدمے قائم ہوتے، ان پر غداری اور وطن دشمنی کے بے بنیاد الزامات عائد کیے گئے اور اس طرح کشمیر کے ان خیر خواہوں کو جسمانی اور ذہنی اذیتیں پہنچا کر انہیں راستے سے ہٹانے کی مذموم کوششیں کی گئیں اور ان کی جگہ ایسے لوگوں کو قوت اور طاقت کے بل بوتے پر عوام کی گردنوں پر مسلط کر دیا گیا جنہیں کشمیری عوام کے مفاد کی جگہ اپنا ذاتی مفاد زیادہ عزیز تھا اس لیے ان بے ضمیر لوگوں نے ریاست کے مستقبل کے متعلق سوچنے کی بجائے بھارت کے مفادات کی حفاظت و پاسبانی کرنا اپنی زندگی کا شیوہ بنا لیا۔ ان لوگوں کی حیثیت بعض کرائے کے سپاہیوں کی سی تھی جنہیں ان کا آقا جس طرح چاہتا بے دریغ استعمال کرتا۔

پھر توپوں کی گرج اور سنگینوں کے سایے میں ایک اسمبلی کے انتخاب کا ڈرامہ کھیلا گیا اور مختلف قسم کی چالبازیوں سے کام لیکر اہلِ دنیا کو یہ تاثر دیا گیا کہ یہ اسمبلی ہی اہلِ ریاست کی دلی آرزوؤں اور تمناؤں کی صحیح معنوں میں نمائندہ اور ترجمان ہے اور چونکہ اس نے بھارت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کر لیا ہے لہٰذا استصواب کی اب قطعاً ضرورت باقی نہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو اور اُن کے رفقاءکار نے کشمیر کے معاملے میں جس قسم کی بدعہدی، چالاکی اور عیاری اور جس نوعیت کے ظلم و استبداد سے کام لیا ہے، اُس پر انسانیت جس قدر بھی ماتم کرے اتنا ہی کم ہے۔ لیکن ہمیں بھارت کے سربراہوں سے کہیں زیادہ افسوس امن کے مغربی علمبرداروں پر ہے جو مظلوموں کی دادرسی کے دعویدار ہیں۔ ان لوگوں نے مکر و فریب کے اس سارے کاروبار کو جس طرح غیر متعلق تماشائی بن کر دیکھا ہے اور جس بے حسی کے ساتھ اسے برداشت کیا ہے بلکہ اس کی طرفداری اور حمایت کی ہے وہ انسانیت کی پیشانی پر ایک ایسا بدنما داغ ہے جسے شاید کبھی مٹایا نہ جاسکے۔

ہندوستان پر ہمارا غیظ و غضب بجا، لیکن ہمیں ذرا خود بھی اپنے اعمال کا جائزہ لیکر دیکھنا چاہیے کہ ہم نے کشمیر کے معاملے میں کس حد تک سیاسی تدبر اور دانشمندی اور اخلاقی ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔

کشمیر کے بارے میں ہم سے بہت سی کوتاہیاں ہوئی ہیں جن کا ذکر شاید سخت تلخ ہو۔ اس لیے ہم اس داستان کو دہرانا نہیں چاہتے لیکن دو تین باتیں ہم قدرے وثوق سے کہہ سکتے ہیں۔ ایک یہ ہم نے اس مسئلہ سے پوری دنیا کو آشنا کرنے کے لیے اتنی کوشش نہیں کی جس کا یہ فی الواقع مستحق ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر پوری انسانیت کے ضمیر کو بیدار کرنے کی ضرورت تھی لیکن ہم نے اس معاملہ میں افسوسناک تساہل سے کام لیا ہے۔ اگر دنیا کی چھوٹی چھوٹی قومیں اپنے نہایت معمولی مسائل کے لیے پوری دنیا کے اندر ہلچل پیدا کرسکتی ہیں اور ساری انسانیت کو اُن کی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوسکتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس معاملہ میں ناکام ہوتے۔ لیکن ہماری سہل پسندی اور بے تدبیری کی وجہ سے اور خاص طور پر ہماری وزارت خارجہ کی عدم توجہی کی بنا پر ہم مسئلہ کشمیر سے دنیا کی قوموں کو پوری طرح روشناس نہیں کرسکے۔ اگر اس کام کو پوری دلسوزی اور ایمانداری کے ساتھ سرانجام دیا جاتا تو ہمیں یقین ہے کہ ہم اس مسئلہ پر اپنے

بہت سے حامی پیدا کر لیتے۔ خصوصاً مسلم ممالک کی کثیر تعداد ہماری تائید پر آمادہ ہو جاتی، اور ہم آج اپنے آپ کو اس طرح تنہا اور بے بس محسوس نہ کرتے جس طرح کہ فی الحقیقت کر رہے ہیں۔

دوسرے ہم نے اس مسئلہ کے حل کرنے کے لیے اینگلو امریکن بلاک پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا ہے۔ ہم گزشتہ پندرہ سالوں میں یہی سمجھتے رہے ہیں کہ امریکہ اور انگلستان ہمارے سچے خیر خواہ ہیں وہ اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کر کے بھارت کو اس بات پر مجبور کر دیں گے کہ وہ کشمیر میں استصواب کرائے اور پھر اس کے نتیجے پر ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرے۔ دوسروں پر اعتماد یقیناً بہت بڑی خوبی ہے لیکن ہم نے اپنے ان مغربی دوستوں کے بارے میں جس قسم کے حسنِ ظن سے کام لیا ہے اسے اگر ابلہ فریبی کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ یو این او کے اجتماعات میں روس کھل کر ہندوستان کے موقف کی حمایت کرتا رہا لیکن ہمارے ان حامیوں نے ایک مرتبہ بھی غیر مبہم الفاظ میں ہماری تائید نہیں کی بلکہ انہیں جب کبھی بھی اس مسئلہ پر اظہارِ خیال کا موقع ملا تو یہی کہا کہ یہ بھارت اور پاکستان کا ذاتی مسئلہ ہے ہم اس میں دخل اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ ہر قدم پر ہمارے مفادات کو نظر انداز کرتے ہوئے بھارت کے ساتھ دوستی بڑھانے کے لیے مختلف قسم کی چالیں چلتے رہے۔ انہوں نے کسی ایک مرحلہ پر بھی اپنی رفاقت کا حق ادا نہ کیا لیکن ہماری سادہ لوحی بلکہ حماقت دیکھیے کہ دجل فریب کی یہ ساری کارروائیاں دیکھنے کے باوجود اُن پر ہمارا اعتماد قطعاً متزلزل نہیں ہوا، ہمیں آج بھی اُن کے عہد و پیمان پر پورا پورا بھروسہ ہے، وہ آج بھی ہماری امیدوں کے مرکز و محور ہیں۔ اور ہمارے مفادات کے واحد محافظ اور نگراں۔ ہم بار بار کی چوٹیں سہنے کے باوجود ابھی تک اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ یہ بلاک ہی ہمارا نجات دہندہ ہے اور اس سے منہ موڑ کر ہم دنیا میں ایک لمحہ کے لیے بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔

ہماری ان خوش فہمیوں بلکہ ابلہ فریبیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم نے ان کی رضا جوئی کے لیے

دنیا کی ہر چیز کو قربان کر دیا ہے۔ بہت سی وہ قومیں جن کے ساتھ ہمارے دینی روابط ہیں اور جن کی مدد پر ہم بجا طور پر اعتماد کر سکتے ہیں انہیں ہم نے اپنی اس غلط روش کی وجہ سے ناراض کر لیا ہے' وہ ہمیں اینگلو امریکن بلاک کا ایک بے بس غلام سمجھتی ہیں، اُن کے نزدیک ہماری اپنی کوئی رائے اور کوئی آزاد پالیسی نہیں، ہم اس استعماری ٹولے کے ہاتھ میں بس ایک کٹھ پتلی ہیں جسے وہ اپنی منشا اور مرضی کے مطابق جس طرح چاہتا ہے، نچواتا چلا جاتا ہے۔

اس رائے میں غلط فہمی اور مبالغہ آمیزی کے اجزا تو شامل ہو سکتے ہیں لیکن اس افسوسناک حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دوسری قومیں اگر ہمارے بارے میں اس قسم کے غلط تصورات رکھتی ہیں تو اُن کے لیے ہمارے طرزِ عمل نے ایک بنیاد بالضرور فراہم کی ہے۔ اُن کی اس غلط فہمی کو سراسر بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا۔ یہ حقیقت اگرچہ بڑی تلخ ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم نے آج تک کسی ایک معاملے میں بھی اینگلو امریکن بلاک کے منشا کے علی الرغم کوئی پالیسی اختیار نہیں کی۔ اس بلاک کی فریب کاری سے جب ہم پر کوئی نئی افتاد آتی ہے تو ہم وقتی طور پر کچھ برہمی کا اظہار کر لیتے ہیں لیکن ہماری اس غلامانہ روش میں قطعاً کوئی فرق نہیں آتا۔

اس غلط پالیسی کا تیسرا نتیجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو ایک خاص حلقے کے اندر محدود کر لیا ہے۔ اس حلقے سے باہر ہمارے نزدیک کوئی قوم موجود ہی نہیں' اس لیے اس کے ساتھ تعلقات استوار کرنا، اس کی اخلاقی تائید حاصل کرنا یا اُس سے تجارتی روابط قائم کرنا، ہمارے لیے سرے سے خارج از بحث ہے۔ ہم ایک گھڑے کی مچھلی بن کر رہ گئے ہیں' اس لیے باہر کی دنیا سے ہمارا اب کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ ہماری اس غلط پالیسی سے ہمیں جتنا نقصان پہنچا ہے اُس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو بین الاقوامی معاملات پر کچھ نظر رکھتے ہیں۔ ہندوستان بھی ہمارے ساتھ آزاد ہوا ہے لیکن چونکہ اُس نے اپنی خارجہ پالیسی کو کسی بلاک کے ساتھ وابستہ نہیں کیا' اس لیے

وہ دنیا کی ہر قوم سے بڑی آزادی کے ساتھ فائدہ اٹھاتا رہا ہے۔ اُس نے روسی بلاک سے بھی بوقت ضرورت بھرپور امداد حاصل کی اور انیگلو امریکن بلاک سے بھی جس طرح چاہا فائدہ اٹھایا۔ اُس کی اس آزاد روش کی وجہ سے بسا اوقات اسے ایسی قوموں کی تائید اور حمایت حاصل ہوئی جن کی حیثیت ہمارے اپنے بھائی بندوں کی سی ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اینگلو امریکن بلاک کی معاشی امداد جس کے احسان کے نیچے ہم اپنے آپ کو اس قدر دبا ہُوا پاتے ہیں وہ بھی ایک بہت بڑا دھوکہ ہے۔ جس کے ذریعے ہمارے ملک کے اندر امریکہ اپنے استعماری عزائم کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔ آخر ہندوستان بھی تو یہ امداد ہم سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر وصول کرتا رہا ہے لیکن اُس نے اس امداد کو اپنی خارجہ پالیسی پر قطعاً اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ اگر یہ امداد ہماری معاشی ترقی اور خوشحالی کے لیے ہے تو پھر ہمیں اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے لیکن اگر یہ ہماری آزادی کا سودا ہے، اگر اس کی صورت ٹرائے کے اس لکڑی کے گھوڑے کی سی ہے، جس کے اندر چھپ کر استعمار ہمارے ملک کے اندر گھسنے کے ناپاک عزائم رکھتا ہے، تو پھر ہم ہزار لعنت بھیجتے ہیں اس امداد پر، اور اُن لوگوں پر جو ہماری اعانت اور دستگیری کی آڑ میں ہم پر غلامی مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ امداد خواہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، اور اُس کے نتائج ہمارے ملک کے لیے کتنے ہی مفید کیوں نہ ہوں، وہ کبھی بھی ہماری آزادی کی قیمت نہیں ہو سکتی۔ کسی قوم کے لیے اُس کی آزادی اور خود مختاری اسے دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔

اگر لنکا جیسی کمزور مملکت غیر ملکی امداد سے صرفِ نظر کرتے ہوئے دنیا میں زندہ رہ کر ترقی کر سکتی ہے تو آخر ہم اس امداد کے بند ہو جانے کے خطرے سے کیوں اتنے ہراساں ہیں۔ سیلون کی حکومت نے تیل کی کمپنیوں کو جب قومی ملکیت بنانے کا فیصلہ کیا تو امریکی مالکان

سخت تلملاتے اور اپنی حکومت کو سیلون کی امداد بند کرنے پر مجبور کردیا لیکن اُس نے اس دباؤ کو پرِکاہ کے برابر بھی نہ سمجھا اور اس معاملے میں جس حیرت انگیز جرأت اور خودداری کا ثبوت دیا وہ تاریخ میں ہمیشہ موجود رہے گا ۔ مسز بندرانائیکے نے اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ غیر ملکی امداد کوئی ایسی ناگزیر چیز نہیں جس پر کسی ملک کے فنا و بقا کا دارومدار ہو۔ اس امداد کی کمی کو فہم و فراست، حسنِ تدبّر، اور جوشِ عمل سے بآسانی پورا کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی قوم دوسری اقوام کی دست نگر ہونے کی بجائے خودداری کے ساتھ زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا عزم کرلے تو کوئی چیز اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہو سکتی۔ قوم کا اجتماعی اخلاق، اس کے مختلف طبقوں کے درمیان اتفاق و اتحاد، اُس کا غیر معمولی اخلاص اور ایثار، اُس کے اندر آگے بڑھنے کا سچا ولولہ، مادی وسائل کے خلا کو بآسانی پُر کر سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں یہ راہ بڑی کٹھن اور دشوار ہے اور افکار و نظریات، اور جذبات و احساسات کی صحت مندانہ تربیت مادی وسائل کی ترقی سے کہیں زیادہ صبر آزما ہوتی ہے اور اس بنا پر بہت سی خواہشات اور تمناؤں کو قربان کرنا پڑتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر ملک کو ایسے وسائل سے ضرور نوازا ہے کہ اس کے رہنے والے اگر چاہیں تو محنت اور اخلاص سے اپنی بنیادی ضروریات ان کے ذریعے بآسانی فراہم کر سکیں۔ خالقِ کائنات کا یہ نظام اشتراک اور تعاون کی طرف تو رہنمائی کرتا ہے اور اس کی ترتیب اس حقیقت کی واضح طور پر نشاندہی کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ قوموں کے درمیان تعصبات کی جو مصنوعی دیواریں حائل ہیں وہ منہدم ہو جائیں، اُن کے مابین ربط و ضبط بڑھے اور مختلف خطّوں کے رہنے والے ایک دوسرے کے دمساز و رفیق بن کر رہیں۔ لیکن قدرت کے اس حکیمانہ نظام میں اس بات کا بھی پورا پورا اہتمام موجود ہے کہ کوئی قوم محض قدرتی وسائل کے بل بوتے پر دوسری اقوام کو غلام نہ بنا سکے اور اسی طرح کوئی قوم صرف مادّی وسائل کی کمی کی وجہ سے اپنے آپ کو غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور نہ پائے۔

جس طرح انسانوں کے درمیان صلاحیتوں کی کمی بیشی ہوتی ہے بالکل اسی طرح مختلف قوموں کے مادی وسائل کے درمیان بھی تھوڑا بہت تفاوت ضرور پایا جاتا ہے لیکن یہ تفاوت ایسا نہیں جس کی بنا پر اُن کی تقدیر متعین ہو۔ مادی اسباب بلاشبہ قومی زندگی میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں لیکن انسان کی فکری اور اخلاقی قوتیں ان اسباب سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ ان قوتوں کے ذریعہ سے انسان نے مادی اسباب کی کمی کو بطریقِ احسن پورا کیا ہے اور دنیا میں وہ حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیئے ہیں جو انسانیت کے لیے آج بھی سرمایۂ افتخار ہیں۔

ہم یہ بات کسی جذباتیت کی بنا پر نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری کی بنا پر کہتے ہیں کہ آج اگر امریکہ ان قرضوں کو بند کر دے تو دنیا کی دوسری بیشمار قومیں ہماری طرف دست تعاون بڑھانے کے لیے تیار ہونگی۔ بین الاقوامی سیاست اس وقت جس نہج پر چل رہی ہے اُس میں ایک لمحہ کے لیے بھی خلا پیدا نہیں ہو سکتا، اور جب بھی ایسی صورتِ حال درپیش ہو تو دوسری بیدار مغز قومیں فوراً آگے بڑھ کر اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس لیے اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ امریکہ سے ترکِ تعلق کے بعد دوسری قومیں لازمی طور پر ہم سے مُنہ موڑ لیں گی اور ہم دنیا میں بے سہارا بن کر رہ جائیں گے۔ سیلون کے معاملے کو ہی دیکھیے، برطانیہ نے بھی اپنے "پیرو مرشد" امریکہ کی پیروی کرنے سے انکار کر دیا ہے اور امداد بند کرنے کی بجائے سیلون سے صرف اس امر کا مطالبہ کیا ہے کہ وہ اسے اُس کی سرمایہ کاری کا مناسب معاوضہ ادا کر دے۔

اگر بالفرض ایک لمحہ کے لیے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ امریکہ کے روٹھ جانے سے ہم پر غیر ملکی امداد کے دروازے ہر طرف سے بالکل بند ہو جائیں گے تو پھر بھی انشاء اللہ ہماری حیاتِ اجتماعی کو کسی

قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا۔ اُس صورت میں ہماری معاشی ترقی کی رفتار اگرچہ قدرے سُست پڑ جائے گی لیکن ہم میں خود اعتمادی پیدا ہوگی اور ہم آزادی کے ساتھ اپنی خارجہ پالیسی طے کر سکیں گے۔ اینگلو امریکن بلاک سے باہر جو قومیں بھی ہیں اُن کا ہمارے معاملے میں طرزِ عمل کافی حد تک تبدیل ہو جائے گا اور اس طرح ہم اپنی دنیا خود آباد کرنے میں کامیاب ہونگے۔ ہم اپنے مخصوص نظریات، حالات اور ضروریات کے تحت اپنے معاشی منصوبے بنائیں گے اور ہماری دولت کا وہ حصّہ جو عیاشیوں پر خرچ ہو رہا ہے وہ کسی مفید کام میں صرف ہوگا۔ دولت کی کمی سے قوم کو بحیثیت مجموعی کبھی نقصان نہیں پہنچتا۔ صرف چند افراد کو جو نہایت اونچے معیارِ زندگی کے عادی ہوتے ہیں انہیں البتہ تھوڑی سی تکلیف ضرور ہوتی ہے لیکن ان کی معمولی تکلیف سے اگر پوری قوم کی آزادی برقرار رہے تو اسے کسی لحاظ سے بھی خسارے کا سودا نہیں کہا جا سکتا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ کئی ایک ملکوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مغربی امداد کے بغیر بھی اقتصادی اور علمی ترقی ممکن ہے۔ کیا روس کا نظام مغرب کی دشمنی کے باوجود پروان نہیں چڑھا۔

پھر اس ضمن میں اس کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ غیر ملکی امداد کو پس ماندہ ممالک میں جس طریق سے استعمال کیا جا رہا ہے وہ بھی بڑا افسوسناک ہے اور اس کے نتائج انتہائی حوصلہ شکن ہیں۔ اس امداد سے ملک خوشحال ہونے کی بجائے قرضوں کی جکڑ بندیوں میں مسلسل جکڑتا چلا جاتا ہے اور اس طرح وہ روز بروز مغربی قوموں کا دست نگر اور محتاج بننے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ اس امداد کا معتدبہ حصہ غیر ملکی ماہرینِ فن "ہڑپ کر جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہمارے ملک کے مخصوص معاشی حالات اور اُس کے تقاضوں سے کوئی گہری واقفیت نہیں رکھتے بس یونہی محض سیر و تفریح کی غرض سے، اور اس ملک کے رہنے والوں کے اندر مغربی تہذیب و تمدن کو فروغ دینے کے لیے کچھ نیم تربیت یافتہ لوگوں کی فوج ظفر موج پسماندہ ممالک میں تشکیل

دی جاتی ہے۔ اور وہاں جا کر ایسے معاشی منصوبے تیار کرتی ہے جن کا وہ ملک کسی لحاظ سے متحمل نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ معاشی منصوبے جلد ہی ایسے مورچوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جن کی حفاظت و پاسبانی سے ہم خود عاجز ہوتے ہیں اور انہیں غیروں کے سپرد کرنے پر اپنے آپ کو بالکل مجبور پاتے ہیں۔ یہ غیر ملکی فوج وہاں بیٹھ کر ہمارے ملک کے معاشی استحکام کے متعلق تدابیر اختیار کرنے کی بجائے اسے سیاسی اعتبار سے بے بس بنانے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتی ہے۔ ان منصوبوں پر اس انداز سے کام شروع کیا جاتا ہے کہ ہم ہر قدم پر امریکہ اور انگلستان کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور رہیں۔

جو لوگ اس ملک کے معاشی حالات اور ان منصوبوں کی رفتار ترقی پر اور ان سے متوقع نتائج پر گہری نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ منصوبے درحقیقت استعمار کے اڈے ہیں اور ان کی تکمیل ہونے تک، ملک کو معاشی لحاظ سے تو شاید تھوڑا سا فائدہ حاصل ہو جائے لیکن ملک پر قرضوں کا اس قدر زیادہ بار پڑ جائے گا جن کی ادائیگی قریب قریب ناممکن ہو گی اور اس طرح اس ملک کی آزادی ہمیں ان قرضوں کے عوض رہن رکھنی پڑے گی۔

پہلے پانچ سالہ معاشی منصوبے کے جو نتائج ہمارے سامنے آئے ہیں وہ انتہائی حوصلہ شکن ہیں اور ہمارے ان خدشات کو تقویت دیتے ہیں۔ اس منصوبہ میں اس بات کا خاص طور پر التزام کیا گیا کہ ہمارا ملک صنعتی اعتبار سے ترقی نہ کرنے پائے اور ہماری زیادہ تر توجہ زراعت پر ہی مرکوز رہے تاکہ ہم امریکہ اور انگلستان کے کارخانوں کو حسب معمول نہایت سستے داموں خام مال مہیا کرتے رہیں۔ ملک میں ایک طرف صنعتی پیداوار کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا مگر زرعی پیداوار کی قیمت جوں کی توں قائم رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اپنی زرعی پیداوار کو خود اپنے ہاں استعمال نہ کر سکنے کی وجہ سے مغربی قوموں کے ہاتھ بیچنے پر مجبور ہوئے اور دوسری طرف مغرب سے ہم ایسا تیار شدہ مال خریدتے رہے جسے ہم تھوڑی سی توجہ کے ساتھ خود اپنے

یاں آسانی کے ساتھ تیار کر سکتے تھے۔ پہلے پانچ سالہ منصوبہ کے ماحصل پر ایک نگاہ ڈالیے تو آپ کو معلوم کر کے حیرت ہو گی کہ محنت اور سرمایہ کے صرف کے باوجود قومی دولت میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا بلکہ افراد کی اوسط آمدنی میں کمی واقع ہوئی ہے۔ اسی طرح زمین کی فی ایکڑ پیداوار بھی کسی حد تک گر گئی ہے لیکن ہم پر قرضوں کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔

ان افسوسناک نتائج کی اصل وجہ یہ ہے کہ مغربی قومیں غیر ملکی سرمایہ کے دباؤ کے تحت ہمیں اپنی محنت اور ملکی وسائل کو ایسے منصوبوں پر صرف کرنے کے لیے مجبور کرتی ہیں جو فی الواقع ہمارے لیے معاشی اعتبار سے کچھ زیادہ مفید اور کارآمد نہیں ہوتے اور ہماری قوم ان کے بوجھ کو برداشت کرنے کی پوری پوری ہمت اور طاقت نہیں رکھتی۔ یہ ہے وہ طریق جس سے معاشی امداد کے مقدس نام پر ہمیں دھوکہ دیا جا رہا ہے اور ہم پر اپنی ہی زمین ساری وسعتوں کے باوجود روز بروز تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ یہ امداد بظاہر تعاون اور ہمدردی کا اظہار ہے لیکن حقیقت میں یہ مکر و فریب کا جال ہے جس میں ہمیں پھنسانا مقصود ہے۔ مغربی قومیں آج ان قرضوں سے وہی کام لینا چاہتی ہیں جو استعمار گزشتہ ایک صدی سے مسیحی شفاخانوں اور سکولوں سے لے رہا ہے۔

مغربی قوموں کی چالیں بڑی گہری ہیں اور وہ ہر محاذ پر امتِ مسلمہ کو شکست دینے کے درپے ہیں کیونکہ اس کی بیداری میں وہ اپنی موت دیکھتی ہیں۔ اس لیے انہوں نے اس ملت کو برباد کرنے کے لیے بڑے ہی وسیع اور ہمہ گیر منصوبے تیار کیے ہیں۔ مغربی افکار و نظریات کے اثر و نفوذ سے وہ اس قوم کی نوخیز نسلوں میں فکری اور ذہنی انتشار پیدا کر رہی ہیں۔ ثقافت اور کلچر کے نام پر اس کے اخلاق کو تباہ و برباد کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا جا رہا ہے۔ عیسائی مشنریوں کی وساطت سے اس کے دین و ایمان کو لوٹنے کی کوششیں جاری ہیں، اور اب قرضوں کے عوض اس کی آزادی اور خودداری کا سودا کیا جا رہا ہے۔

وہ دن امتِ مسلمہ کے لیے بڑا مبارک ہو گا جب وہ مغرب کے بچھائے ہوئے دام ہمرنگِ زمین کو دیکھنے میں کامیاب ہو گی اور اس طرح اس کی چالبازیوں اور عیاریوں کا پردہ چاک کر کے وہ اپنے اندر اس کے اصل عزائم کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرے گی۔ خدا کرے کہ وہ دن جلد آئے کہ ہم میں صحیح بصیرت پیدا ہو اور ہم مغربی قوموں کا غلام بننے کی بجائے خداوند تعالیٰ کی غلامی اختیار کر کے دوسری ہر قسم کی غلامی سے نجات حاصل کر سکیں۔

تفہیم القرآن

یٰسٓ

(۴)

ہم چاہیں تو ان کی آنکھیں موند دیں، پھر یہ راستے کی طرف لپک کر دیکھیں، کہاں سے انہیں راستہ سجھائی دے گا؟ ہم چاہیں تو انہیں ان کی جگہ ہی پر اس طرح مسخ کر کے رکھ دیں کہ یہ نہ آگے چل سکیں نہ پیچھے پلٹ سکیں؂۵۶ جس شخص کو ہم لمبی عمر دیتے ہیں اس کی ساخت کو ہم اُلٹ ہی دیتے ہیں؂۵۷ کیا (یہ حالات دیکھ کر) انہیں عقل نہیں آتی؟

؂۵۶ قیامت کا نقشہ کھینچنے کے بعد اب انہیں بتایا جا رہا ہے کہ یہ قیامت تو خیر تمہیں دُور کی چیز نظر آتی ہے، مگر ذرا ہوش میں آ کر دیکھو کہ خود اس دنیا میں، جس کی زندگی پر تم پھولے ہوئے ہو، تم کس طرح اللہ کے دستِ قدرت میں بے بس ہو۔ یہ آنکھیں جن کی بینائی کے طفیل تم اپنی دنیا کے سارے کام چلا رہے ہو، اللہ کے ایک اشارے سے اندھی ہو سکتی ہیں۔ یہ ٹانگیں جن کے بل پر تم یہ ساری دوڑ دھوپ دکھا رہے ہو، اللہ کے ایک حکم سے ان پر اچانک فالج گر سکتا ہے۔ جب تک اللہ کی دی ہوئی یہ طاقتیں کام کرتی رہتی ہیں، تم اپنی خودی کے زعم میں مدہوش رہتے ہو، مگر جب ان میں سے کوئی ایک طاقت بھی جواب دے جاتی ہے تو تمہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ تمہاری بساط کتنی ہے۔

؂۵۷ ساخت اُلٹ دینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑھاپے میں آدمی کی حالت بچوں کی سی کر دیتا ہے۔ اُسی طرح وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوتا ہے۔ اُسی طرح دوسرے اسے اٹھاتے بٹھاتے اور سہارا دے کر چلاتے ہیں۔ اُسی طرح دوسرے اس کو کھلاتے پلاتے ہیں۔ اُسی طرح وہ اپنے

ہم نے اِس (نبی) کو شعر نہیں سکھایا ہے اور نہ شاعری اس کو زیب ہی دیتی ہے ۵۸ ۔ یہ تو ایک نصیحت ہے اور صاف پڑھی جانے والی کتاب، تاکہ وہ ہر اُس شخص کو خبردار کر دے جو زندہ ہو ۵۹ اور انکار کرنے والوں پر حجت قائم ہو جائے۔

کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں ۶۰ میں سے اِن کے لیے مویشی پیدا کیے اور اب یہ ان کے مالک ہیں۔ ہم نے اُنہیں اس طرح اِن کے بس میں کر دیا ہے کہ اُن میں سے کسی پر یہ سوار ہوتے ہیں، کسی کا یہ گوشت کھاتے ہیں، اور اُن کے اندر اِن کے لیے طرح طرح کے فوائد اور مشروبات ہیں۔ پھر کیا یہ شکر گزار نہیں ہوتے؟ ۶۱ یہ سب کچھ ہوتے

کپڑوں میں اور اپنے بستر پر رفع حاجت کرنے لگتا ہے۔ اُسی طرح وہ ناسمجھی کی باتیں کرتا ہے جس پر لوگ ہنستے ہیں۔ غرض جس کمزوری کی حالت سے اس نے دنیا میں اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا اختتام زندگی پر وہ اسی حالت کو پہنچ جاتا ہے۔

۵۸ یہ اس بات کا جواب ہے کہ کفار توحید و آخرت اور زندگی بعد موت اور جنت و دوزخ کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی باتوں کو محض شاعری قرار دے کر اپنے نزدیک بے وزن ٹھیرانے کی کوشش کرتے تھے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم ص ۶۵۲ تا ۵۴۹)۔

۵۹ یعنی سوچنے اور سمجھنے والا انسان ہو۔ جس کی حالت پتھر کی سی نہ ہو کہ آپ اس کے سامنے خواہ کتنی ہی معقولیت کے ساتھ حق اور باطل کا فرق بیان کریں، اور کتنی ہی دردمندی کے ساتھ اس کو نصیحت کریں، وہ نہ کچھ سنے، نہ سمجھے اور نہ اپنی جگہ سے سرکے۔

۶۰ "ہاتھوں" کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے بطور استعارہ استعمال ہوا ہے۔ اِسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ معاذ اللہ وہ ذاتِ پاک جسم رکھتی ہے اور انسانوں کی طرح ہاتھوں سے کام کرتی ہے بلکہ اس سے یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے خود بنایا ہے، ان کی تخلیق میں کسی دوسرے کا ذرہ برابر دخل نہیں ہے۔

ہوتے انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے خدا بنا لیے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ اِن کی مدد کی جائیگی
وہ اِن کی کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ یہ لوگ اُلٹے اُن کے لیے حاضر باش لشکر بنے ہوئے ہیں۔[۶۲]
اچھا، جو باتیں یہ بنا رہے ہیں وہ تمہیں رنجیدہ نہ کریں، اِن کی چھپی اور کھلی سب باتوں کو ہم جانتے ہیں[۶۳]

---

[۶۱] نعمت کو مُنعِم کے سوا کسی اور کا عطیہ سمجھنا، اس پر کسی اور کا احسان مند ہونا، اور منعم کے سوا کسی اور سے نعمت پانے کی امید رکھنا یا نعمت طلب کرنا، یہ سب کفرانِ نعمت ہے۔ اسی طرح یہ بھی کفرانِ نعمت ہے کہ آدمی منعم کی دی ہوئی نعمت کو اس کی رضا کے خلاف استعمال کرے۔ لہٰذا ایک مشرک اور کافر اور منافق اور فاسق انسان، محض زبان سے شکر کے الفاظ ادا کر کے خدا کا شاکر بندہ قرار نہیں پا سکتا۔ کفارِ مکہ اس بات کے منکر نہ تھے کہ اِن جانوروں کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا تھا کہ ان کے پیدا کرنے میں دوسرے معبودوں کا کوئی دخل ہے۔ مگر یہ سب کچھ ماننے کے باوجود جب وہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں پر اپنے معبودوں کے شکریے بجا لاتے اور ان کے آگے نذریں اور نیازیں پیش کرتے اور ان سے مزید نعمتوں کی دعائیں مانگتے اور ان کے لیے قربانیاں کرتے تھے تو خدا کے لیے ان کا زبانی شکر بالکل بے معنی ہو جاتا تھا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ ان کو کافرِ نعمت اور احسان فراموش قرار دے رہا ہے۔

[۶۲] یعنی وہ جھوٹے معبود بے چارے خود اپنے بقا اور اپنی حفاظت اور اپنی ضروریات کے لیے اپنے اِن عبادت گزاروں کے محتاج ہیں۔ اِن کے لشکر نہ ہوں تو اُن غریبوں کی خدائی ایک دن نہ چلے۔ یہ اُن کے حاضر باش غلام بنے ہوئے ہیں۔ یہ اُن کی بارگاہیں بنا اور سجا رہے ہیں۔ یہ اُن کے لیے پروپیگنڈا کرتے پھرتے ہیں۔ یہ خلقِ خدا کو ان کا گرویدہ بناتے ہیں۔ یہ ان کی حمایت میں لڑتے اور جھگڑتے ہیں۔ تب کہیں ان کی خدائی چلتی ہے۔ ورنہ ان کا کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہو۔ وہ اصلی خدا نہیں ہیں کہ کوئی اس کو مانے یا نہ مانے، وہ اپنے زور پر آپ ساری کائنات کی فرمانروائی کر رہا ہے۔

[۶۳] خطاب ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اور کھلی اور چھپی باتوں کا اشارہ اس طرف ہے کہ کفارِ مکہ کے وہ بڑے بڑے سردار جو آپ کے خلاف جھوٹ کے طوفان اٹھا رہے تھے، وہ

کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا؟ اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔ کہتا ہے

اپنے دلوں میں جانتے، اور اپنی نجی محفلوں میں مانتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو الزامات وہ لگا رہے ہیں وہ سراسر بے اصل ہیں۔ وہ لوگوں کو آپ کے خلاف بدگمان کرنے کے لیے آپ کو شاعر، کاہن، ساحر، مجنون اور نہ معلوم کیا کیا کہتے تھے، مگر خود ان کے ضمیر اس بات کے قائل تھے، اور آپس میں وہ ایک دوسرے کے سامنے اقرار کرتے تھے کہ یہ سب جھوٹی باتیں ہیں جو محض آپ کی دعوت کو نیچا دکھانے کے لیے وہ گھڑ رہے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے فرماتا ہے کہ ان لوگوں کی بیہودہ باتوں پر رنجیدہ نہ ہو۔ سچائی کا مقابلہ جھوٹ سے کرنے والے آخر کار اس دنیا میں بھی ناکام ہوں گے اور آخرت میں بھی اپنا بُرا انجام دیکھ لیں گے۔

۶۴؎ اب کفار کے اُس سوال کا استدلالی جواب دیا جا رہا ہے جو آیت ۴۸ میں نقل کیا گیا تھا۔ اُن کا یہ سوال کہ "قیامت کی دھمکی کب پُوری ہو گی" کچھ اس غرض کے لیے نہ تھا کہ وہ قیامت کے آنے کی تاریخ معلوم کرنا چاہتے تھے، بلکہ اس بنا پر تھا کہ وہ مرنے کے بعد انسانوں کے دوبارہ اٹھائے جانے کو بعید از امکان، بلکہ بعید از عقل سمجھتے تھے۔ اسی لیے ان کے سوال کے جواب میں امکان آخرت کے دلائل ارشاد ہو رہے ہیں۔

ابن عباس، قتادہ اور سعید بن جُبیر کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر کفارِ مکہ کے سرداروں میں سے ایک شخص قبرستان سے کسی مُردے کی ایک بوسیدہ ہڈی لیے ہوئے آ گیا اور اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے توڑ کر اور اس کے منتشر اجزاء ہوا میں اڑا کر آپ سے کہا، اے محمدؐ، تم کہتے ہو کہ مُردے پھر زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ بتاؤ، ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟ اس کا جواب فوراً ان آیات کی صورت میں دیا گیا۔

۶۵؎ یعنی وہ نطفہ جس میں محض ایک ابتدائی جرثومۂ حیات کے سوا کچھ نہ تھا، اس کو ترقی دے کر ہم نے اس حد تک پہنچایا کہ وہ نہ صرف جانوروں کی طرح چلنے پھرنے اور کھانے پینے لگا،

کون اِن ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں۔ اس سے کہو، اِنہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے اُنہیں پیدا کیا تھا، اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔ وہی جس نے تمہارے لیے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی اور تم اس سے اپنے چولھے روشن کرتے ہو۔[۶۸] کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اِس پر قادر نہیں ہے کہ اِن جیسوں کو پیدا کر سکے؟ کیوں نہیں، جبکہ وہ ماہر خلّاق ہے۔ وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے، اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔ع۵

بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس میں شعور و تعقّل اور بحث و استدلال اور تقریر و خطابت کی وہ قابلیتیں پیدا ہو گئیں جو کسی حیوان کو نصیب نہیں ہیں، حتیٰ کہ اب وہ اپنے خالق کے بھی منہ آنے لگا ہے۔

[۶۶] یعنی ہمیں مخلوقات کی طرح عاجز سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ جس طرح انسان کسی مردہ کو زندہ نہیں کر سکتا، اُسی طرح ہم بھی نہیں کر سکتے۔

[۶۷] یعنی یہ بات بھول جاتا ہے کہ ہم نے بے جان مادہ سے وہ ابتدائی جرثومۂ حیات پیدا کیا جو اس کا ذریعۂ تخلیق بنا، اور پھر اس جرثومے کو پرورش کر کے اسے یہاں تک بڑھا لائے کہ آج وہ ہمارے سامنے باتیں چھانٹنے کے قابل ہوا ہے۔

[۶۸] یا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ہرے بھرے درختوں میں وہ آتش گیر مادہ رکھا ہے جس کی بدولت تم لکڑیوں سے آگ جلاتے ہو۔ یا پھر یہ اشارہ ہے مَرْخ اور عَفَار نامی اُن دو درختوں کی طرف جن کی ہری بھری ٹہنیوں کو لے کر اہلِ عرب ایک دوسرے پر مارتے تھے تو اُن سے آگ جھڑنے لگتی تھی۔ قدیم زمانہ میں عرب کے بدو آگ جلانے کے لیے یہی چقماق استعمال کیا کرتے تھے اور ممکن ہے آج بھی کرتے ہوں۔

غلافِ کعبہ اسکی شرعی حیثیت اور اسکی تاریخ

اس سال ایک مدتِ دراز کے بعد پاکستان کو غلافِ کعبہ تیار کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے ۶۶۴ھ (۱۲۶۷ء) میں ایک مرتبہ اس ملک سے غلاف بنوا کر بھیجا گیا تھا، اور پھر ۱۹۲۸ سے ۱۹۳۲ء تک ہند و پاکستان کے لوگوں کو اس خدمت کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ اس کے بعد اب یہ تیسرا موقع ہے کہ اس ملک کے لوگ یہ سعادت حاصل کر رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس پر مسلمانانِ پاکستان میں عام جوشِ مسرت پایا جاتا ہے۔

اس موقع پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غلافِ کعبہ سے متعلق ایک مختصر مضمون لکھا جائے تاکہ عام لوگ اس کی تاریخ اور اس کی اہمیت سے اچھی طرح واقف ہو جائیں اور یہ بھی جان لیں کہ شریعت میں اس کی حیثیت کیا ہے۔

شرعی حیثیت قرآن مجید سے ثابت ہے کہ خانہ کعبہ وہ عمارت ہے جو اب سے چار ہزار سال پہلے اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے مل کر تعمیر کیا تھا۔ اور یہ بات بھی قرآن میں بصراحت ارشاد ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنا گھر قرار دیا اور ہمیشہ کے لیے قبلۂ اہلِ توحید بنا دیا۔ یہ امور تو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہیں، اس لیے ان پر کسی بحث و گفتگو کی حاجت نہیں۔ البتہ یہ بات عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ اس پر غلاف چڑھانے کی شرعی حیثیت کیا ہے اور اس میں کیا حکمت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ کوئی بدعت ہے جو بعد کے کسی زمانے میں شروع ہوئی ہے۔ یہ خیالات بھی بعض ذہنوں میں پائے جاتے ہیں کہ اس عمارت پر غلاف چڑھانا بے جا اسراف ہے، کیوں نہ اتنا روپیہ غریب انسانوں کی تن پوشی پر صرف کیا جائے۔ یہ شبہات بھی بعض حلقوں کی طرف سے ظاہر کیے گئے ہیں کہ اس غلاف کے احترام

اور اس کی روانگی کے اہتمام اور اس کی مشایعت اور زیارت میں شرک کا شائبہ ہے۔ یہ غلط فہمیاں چونکہ واقفیت کی کمی کے باعث لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں، اس لیے سب سے پہلے ہم ان کو رفع کرینگے۔

کسی فعل کے متعلق جب معتبر و مستند ذرائع سے ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کیا ہے، یا وہ آپ کے سامنے ہوا ہے اور آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا ہے، تو اس کے بارے میں یہ گمان کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ بدعت ہے۔ کعبہ کے متعلق یہ بات احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ فتح مکہ سے پہلے جبکہ یہ گھر کفار قریش کی تولیت میں تھا، اس پر غلاف چڑھا ہوا تھا، اور فتح کے بعد جب وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تولیت میں آیا، تو نہ صرف یہ کہ آپ نے اسے باقی رکھا، بلکہ غلاف چڑھانے کے طریقہ پر خود عمل کیا، اور غلاف چڑھانے کے اس فعل کا ذکر تعظیم و تکریم کے ساتھ فرمایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ:

كانوا يصومون عاشوراء قبل ان يفرض رمضان وكان يوما تستر فيه الكعبة (بخاری، کتاب الحج)

رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے مسلمان یوم عاشورا (۱۰ محرم) کا روزہ رکھا کرتے تھے اور یہ وہ دن تھا جب خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا جاتا تھا۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اسلام سے پہلے کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

انی لمستتر باستار الكعبة اذ جاء ثلاثة نفر ثقفی وختناه قرشيان، كثير شحم بطونهم قليل فقه قلوبهم فتحدثوا بينهم حديثا فقال احدهم اترى ان الله عز وجل يسمع ما قلنا؟ قال الآخر يسمع اذا رفعنا ولا

میں خانہ کعبہ کے پردوں میں چھپا ہوا تھا کہ تین آدمی آئے۔ ایک ثقیف کا تھا اور دو اس کے قریشی داماد تھے۔ تینوں بڑے موٹے تازے تھے مگر عقل و فہم سے عاری۔ انہوں نے آپس میں کچھ باتیں کیں۔ پھر ایک نے کہا، تمہارا کیا خیال ہے، یہ باتیں جو ہم نے کی ہیں کیا اللہ تعالیٰ نے

یسمع اذا خفضنا۔ قال الآخران کان یسمع شیئاً منہ انہ یسمعہ کلہ (مسند احمد۔ مرویات ابن مسعود رضی اللہ عنہ)	ان کو سن لیتا ہے ؟ دوسرے نے کہا میرا خیال یہ ہے کہ جب ہم زور سے بات کرتے ہیں تو اللہ اس کو سن لیتا ہے اور جب آہستہ بولتے ہیں تو وہ اسے نہیں سنتا تیسرے نے کہا اگر وہ کچھ سنتا ہے تو پھر ساری باتیں سنتا ہے

یہ دونوں روایات ظاہر کرتی ہیں کہ فتح مکہ سے پہلے اہل عرب خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا کرتے تھے۔ اس کے بعد حضرت انس بن مالک کی حسب ذیل روایت ثابت کرتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ فتح کر لیا تو آپ نے زمانہ جاہلیت کے اس طریقے کو برقرار رکھا، حالانکہ جاہلیت کی جتنی یادگاریں اسلام کے خلاف تھیں ان کو آپ نے بلا تاخیر مٹا دیا تھا۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخل مکۃ وعلی راسہ المغفر فلما نزعہ جاء رجل فقال ابن خطل متعلق باستار الکعبۃ فقال اقتلہ (بخاری، کتاب المغازی۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد۔ نسائی کتاب الحج)	نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے اور آپ سر پر خود پہنے ہوئے تھے۔ جب آپ نے خود اتارا تو ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ ابن خطل کعبہ کے پردوں سے لپٹا کھڑا ہے۔ حضور نے فرمایا اسے قتل کر دو۔

اس روایت کی تائید حضرت سعد بن ابی وقاص کی یہ روایت کرتی ہے جو اُن کے صاحبزادے حضرت مُصعب بن سعد نے نقل کی ہے :

لما کان یوم فتح مکۃ امّن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الناس الا اربعۃ نفر وامرأتین وقال اقتلوھم وان	جب فتح مکہ کا دن آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں کو امان دی، مگر چار مردوں اور دو عورتوں کے متعلق فرمایا کہ

وجد تموھم متعلقین باستار الکعبہ (نسائی، کتاب تحریم الدم) — ان کو قتل کر دو خواہ وہ کعبہ کے پردوں ہی سے چمٹے ہوئے ہوں۔

ان روایتوں کے باوجود یہ شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ شاید عین فتح کے موقع پر حضورؐ نے غلاف نہ اتروایا ہو اور بعد میں اس کو اتروا دیا ہو۔ لیکن ایک دوسری روایت اس شبہ کو رفع کر دیتی ہے۔ اس میں حضرت عُروہ بن زبیر فتح مکہ کا قصہ بیان کرتے ہوئے ذکر کرتے ہیں کہ اس روز حضرت سعد بن عُبادہ نے ابوسفیانؓ کو مخاطب کر کے کہا الیوم یوم الملحمۃ الیوم تستحل الکعبۃ (آج قتل و خون کا دن ہے، آج کعبہ حلال کر دیا جائیگا)۔ اس بات کی شکایت ابوسفیان نے جا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا:

كذب سعد. ولكن هذا يوم يعظم الله فيه الكعبة ويوم تكسى فيه الكعبة (بخاری، کتاب المغازی، غزوۃ الفتح) — سعد نے غلط کہا۔ بلکہ آج تو وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ کعبہ کی عظمت قائم فرمائے گا اور وہ دن ہے جب کعبہ پر غلاف چڑھایا جائے گا۔

آخری فقرے کی تشریح کرتے ہوئے علامہ ابن حجر فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ "اس ارشاد سے حضورؐ کا مطلب یہ تھا کہ اب ہم کعبہ پر غلاف چڑھائیں گے، اور ایسا ہی ہوا" اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ حضورؐ کا یہ ارشاد اس حقیقت پر بھی دلالت کرتا ہے کہ خانۂ کعبہ پر غلاف چڑھانا اُس کی تعظیم کے مقتضیات میں سے ہے۔ اسی بنا پر علمائے اُمت اس کے جواز پر متفق ہیں۔ علامہ ابن حجر لکھتے ہیں "کعبہ کے لیے وہ تعظیم ہے جو دوسری مساجد کے لیے نہیں ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ کعبہ کو حریر و دیبا سے ڈھانکنا جائز ہے مگر مساجد پر اس طرح کے پردے ڈالنے کے جواز میں اختلاف ہے ... کعبہ کو غلاف سے ڈھانکنے کے جواز پر اجماع ہے" (فتح الباری، کتاب الحج، باب کسوۃ الکعبۃ)۔ اور یہی بات علامہ بدرالدین عینی بھی ایک حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "اس میں غلاف کعبہ کے

مشروع ہونے کی دلیل پائی جاتی ہے" (عمدۃ القاری، کتاب الحج، باب کسوۃ الکعبہ)

اسراف بے جا کا شبہ رہا یہ شبہ کہ اس میں بے جا اسراف ہے، کیوں نہ یہی کپڑا غریبوں کی تن پوشی پر صرف کیا جاتے، تو اس کا جواب ہمیں اس واقعہ میں مل جاتا ہے جو بخاری، ابن ماجہ اور طبرانی نے نقل کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک صاحب ابو وائل، خانہ کعبہ کے کلید بردار شیبہ [illegible] کہ طواف پر ھنے [illegible] شیبہ نے [illegible] پوچھا، کیا یہ تم اپنی طرف سے دے رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ ایک اور شخص کا ہدیہ ہے جو اس نے میرے سپرد کیا تھا، میرا اپنا مال ہوتا تو میں ہدیہ نہ کرتا۔ [illegible] شیبہ [illegible] نے کہا جہاں تم بیٹھے ہو اسی جگہ (یعنی خانہ کعبہ کے اندر) ایک دفعہ حضرت عمرؓ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا میں کعبہ کے خزانے میں رتی بھر سونا اور چاندی بھی نہ رہنے دوں گا، سب کچھ فقراء مسلمین میں تقسیم کر دوں گا۔ میں نے کہا آپ کے دونوں پیشرووں (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر) نے تو ایسا نہیں کیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر کہا کہ وہ تو یقیناً راست رو لوگ تھے، میں انہی کے نقشِ قدم پر چلوں گا۔

اسی سے ملتی جلتی ایک اور روایت عبدالرزاق نے حضرت حسن بصری سے نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ کعبہ کے خزانے کو راہِ خدا میں خرچ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ حضرت اُبَی بن کعب کے سامنے انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا آپ کو یہ کام کرنے کا حق نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا یہ کیوں؟ انہوں نے جواب دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن تمام ہدیوں اور نذر کے اموال کو جوں کا توں رہنے دیا تھا جو زمانہ جاہلیت سے کعبہ کے خزانے میں چلے آ رہے تھے۔
اب یہ ظاہر ہے کہ اگر سونے چاندی کے وہ ظروف تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی رہنے دیے جو خانہ کعبہ کے لیے زمانۂ جاہلیت میں ہدیے کے طور پر دیئے گئے تھے، تو غلاف کعبہ پر جو مال خرچ ہوتا ہے وہ اسراف کی تعریف میں کیسے آ سکتا ہے۔ حضور کے اس فعل ہی کی وجہ سے علماء اسلام میں کبھی خانہ کعبہ کو ریشمی غلاف پہنانے کے جواز پر اختلاف نہیں ہوا صحابہ

وتابعین کے زمانے سے ریشمی غلاف پہنانے کا یہ عمل چلا آرہا ہے، اور اس مسئلے میں کسی کی اختلافی رائے منقول نہیں ہوئی۔

<u>شرک کا شبہ</u> اس کے بعد یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ کعبے پر غلاف چڑھانا تو درست، مگر کیا وہ غلاف جو کعبے کے لیے تیار کیا گیا ہو، اس کا بھی مستحق [illegible] احترام کیا جاتا ہے۔ اس کی زیارت کے لیے [illegible] کی مجالس اور اسے بڑے اہتمام کے ساتھ روانہ کیا جاتا ہے؟ کیا ان افعال میں شرک نہیں پایا جاتا؟ یہ غلاف آخر ایک کپڑا ہی تو ہے محض اس بنا پر کہ یہ کعبے پر چڑھانے کے لیے تیار کیا گیا ہے، اس کی تعظیم و تکریم کیسے جائز ہو گئی؟

اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے پہلے اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ خانۂ کعبہ خود اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ پتھر کی بنی ہوئی ایک عمارت ہے۔ معاذ اللہ وہ نہ خود خدا ہے، نہ خداوند عالم اس میں رہتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اسے تمام دنیا کے اہلِ توحید کا قبلہ بنا دیا جس کی طرف رخ کر کے ہر مومن قیام و قعود اور رکوع و سجود کرتا ہے۔ دوسرے مقامات پر تو کعبہ سامنے نہیں ہوتا لیکن مسجد حرام میں تو سب کی آنکھوں کے سامنے وہ موجود ہوتا ہے اور مسجد کے اندر ہر طرف سے لوگ اسی کی طرف رخ کر کے ارکان نماز ادا کرتے ہیں جن میں رکوع بھی شامل ہے اور سجدہ بھی۔ پھر حج اور عمرے میں اس عمارت کے گرد طواف کیا جاتا ہے اور ہر طواف کی ابتدا حجرِ اسود کو چوم کر کی جاتی ہے جو ظاہر ہے کہ ایک پتھر کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیا ان میں سے کسی فعل کو بھی شرک کہا جا سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرک کی جڑ کاٹنے کے لیے جو طریقہ اختیار فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ اظہارِ عبودیت کی جو جو صورتیں دنیا میں پائی جاتی ہیں، اور انسانی فطرت پرستش کی جن جن شکلوں کا تقاضا کرتی ہے، ان سب کو ہر دوسری جگہ ممنوع ٹھیرا دیا، اور صرف ایک خانۂ کعبہ کو اپنا گھر قرار دے کر حکم دے دیا کہ ان سب صورتوں سے یہاں ہمارے حضور بندگی بجا لاؤ۔ اپنے معبود کے سامنے رکوع و سجود کرنا چاہتے ہو تو اس گھر کی طرف رخ کر کے جھکو، اور کسی دوسری چیز کے آگے نہ جھکو۔ طواف کرنا چاہتے ہو تو یہ ہمارا گھر ہے، اس کا طواف کرو، کسی اور چیز کا

طواف نہ کرو۔ آستانہ بوسی کرنا چاہتے ہو تو حجرِ اسود ہمارا سنگِ آستاں ہے۔ اسے چُومو اور کسی دوسرے آستانے کو نہ چُومو۔ معبود کی چوکھٹ سے چمٹ کر دعائیں کرنا چاہتے ہو تو مُلتَزَم ہماری چوکھٹ ہے، اس سے لپٹو اور گڑگڑا کر دعائیں مانگو۔ تیرتھ یاترا کرنا چاہتے ہو تو یہ تمہارے لیے تیرتھ ہے، اس کی زیارت کے لیے دنیا بھر سے کھنچ کھنچ کر آؤ اور ہر دوسرے تیرتھ کی یاترا چھوڑ دو۔ اپنے معبود کی بارگاہ پر چادریں چڑھانا چاہتے ہو تو یہ ہماری بارگاہ ہے، چادر چڑھانے کا جو جذبہ تمہارے دل میں ہے، یہاں چادر چڑھا کر اس کی تسکین کر لو اور پھر کسی دوسری جگہ چادریں نہ چڑھاتے پھرو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا میں ایک گھر کو اپنی طرف نسبتِ خاص دے کر پرستش کی اُن ساری شکلوں کو جو مشرکین اپنے بناوٹی معبودوں کے لیے اختیار کرتے تھے، ہر آستانے پر حرام کر دیا اور اہلِ توحید کو حکم دیا کہ وہ ساری شکلیں ہمارے اِس آستانے پر برتی جائیں اور بس اِسی جگہ کے لیے مختص رہیں۔ یُوں خانہ کعبہ کا حکم ہر دوسرے مقام سے مختلف ہو گیا ہے۔ جو کچھ دوسری جگہ شرک ہے وہ یہاں توحید ہے۔

ایسا ہی معاملہ اُن اشیاء کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی خاطر خانۂ کعبہ میں پیش کرنے کے لیے بھیجی جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو شعائر اللہ (خدا پرستی کی نشانیاں) قرار دیا ہے اور ان کے احترام کا حکم دیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ۔ (المائدہ ۔۲)

اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، اللہ کے شعائر کو حلال نہ کر لو، اور نہ ماہِ حرام کو، اور نہ ہدی کو اور نہ اُن ہاروں کو جو ہدی کے گلے میں لٹکائے جاتے ہیں اور نہ بیت الحرام کے قصد سے سفر کرنے والوں کو۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ (الحج ۔۳۶)

اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے شعائر اللہ میں سے قرار دیا ہے۔

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ

اور جو شخص شعائر اللہ کی تعظیم کرے، تو یہ دلوں کے

تَقْوَى الْقُلُوبِ۔ (الحج-۳۲) تقویٰ کی نشانی ہے۔

دیکھیے، ماہِ حرام کیا ہے؟ مہینوں میں سے ایک مہینہ ہی تو ہے۔ مگر کعبے کی نسبت نے اسے شعائر اللہ میں داخل کر دیا۔ ہدی کے اونٹ آخر جانوروں کے سوا اور کیا ہیں؟ مگر چونکہ وہ کعبے کی طرف نذر کے طور پر لے جائے جاتے ہیں اس لیے وہ بھی شعائر اللہ میں شمار ہو گئے۔ اہلِ عرب قدیم زمانے میں ان اونٹوں کے گلے میں جوتوں کے ہار لٹکا دیتے تھے تاکہ دور سے ہی دیکھ کر ہر شخص معلوم کر لے کہ یہ ہدی کے اونٹ ہیں۔ یہ ہار بھی شعائر اللہ بن گئے، کیونکہ انہیں اللہ کے گھر سے نسبت نصیب ہو گئی۔ اب ان شعائر کی تعظیم و تکریم ان اشیاء کی تعظیم و تکریم نہیں بلکہ اُس نسبت کی تعظیم و تکریم ہے جو انہیں اللہ کے گھر سے حاصل ہو چکی ہے۔ اُن کی تعظیم کو اللہ تعالیٰ اس بات کی علامت قرار دے رہا ہے کہ جو شخص ایسا کرتا ہے اس کے دل میں تقویٰ ہے۔ اِس کے بعد یہ سمجھنے میں آخر کیا مشکل ہے کہ جو کپڑا کعبے پر غلاف چڑھانے کے لیے تیار کیا جاتا ہے، اُس کا احترام بھی ایک کپڑے کا احترام نہیں بلکہ اُس نسبت کا احترام ہے جو اسے کعبے کے ساتھ ہو گئی ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے جو شخص بھی آتا ہے اسے اللہ کے گھر کی محبت کھینچ کر لاتی ہے نہ کہ ایک کپڑے کو دیکھنے کی خواہش۔ اسے بیت اللہ کی طرف بھیجنے کے لیے جو مشایعت کی جاتی ہے وہ اُس شوق کا ایک مظہر ہے جو مسلمان خود بیت اللہ کی زیارت کے لیے اپنے دلوں میں پاتے ہیں۔ اس حد تک جو کچھ کیا جاتا ہے وہ تو شرک کی تعریف میں نہیں آتا۔ البتہ اس سے تجاوز کر کے اگر کوئی شخص غلاف کو چومے اور اس کا طواف کرے اور اس سے چمٹ کر دعائیں مانگے اور اس کی طرف رُخ کر کے رکوع و سجود کرنے لگے تو یہ بلاشبہ شرک ہو گا کیونکہ یہ سب امور صرف بیت اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں غلاف کے کپڑے کو اللہ نے اپنا گھر قرار نہیں دیا ہے۔

غلاف کی تاریخ اب ہم مختصراً یہ بیان کریں گے کہ کعبہ پر غلاف چڑھانے کی ابتدا کب ہوئی اور اس وقت سے آج تک اس کی تاریخ کیا رہی ہے۔ اس تاریخ کے ماخذ حسبِ ذیل ہیں (۱) فتح الباری شرح صحیح بخاری، علامہ ابن حجر۔ (۲) سیرت ابن ہشام۔ (۳) اخبارِ مکہ، محمد بن عبداللہ الازرقی (۴) شفاء الغرام

تقی الدین الفاسی۔ (۵) الاعلام، قطب الدین الحنفی (۶) تاریخ الکعبہ، عبداللہ باسلامہ (۷) مرآۃ الحرمین، ابراہیم رفعت پاشا۔

فتح مکہ سے پہلے غلاف کے بارے میں زمانۂ قدیم کی تاریخ کا کوئی مرتب اور معتبر ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ لیکن اُس زمانے کی جو روایات علمائے اسلام تک پہنچی ہیں ان میں بیان کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کعبے پر غلاف چڑھایا تھا۔ اس کے بعد صدیوں تک تاریخ خاموش ہے۔ پھر یہ ذکر ملتا ہے کہ عدنان نے یہ خدمت انجام دی۔ اس کے بعد پھر کئی صدی تک کی تاریخ غائب ہے۔ تیسرا شخص جس کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس نے سرخ رنگ کے دھاری دار یمنی کپڑے (الوصائل) کا مکمل غلاف کعبے پر چڑھایا وہ یمن کا ایک بادشاہ اسعد تھا جس کا زمانہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دو سو برس پہلے گزرا ہے۔

غلاف کی مسلسل تاریخ ہم کو اُس وقت سے ملتی ہے جب خانہ کعبہ کا انتظام قبیلہ قریش کے ہاتھوں میں آیا۔ اس قبیلے کی روایات زمانۂ اسلام تک محفوظ رہی ہیں، اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے اس نے انتظام سنبھالا، اس کے مختلف خاندان ہر سال باری باری سے کعبے پر غلاف چڑھایا کرتے تھے۔ پھر بنی مخزوم کے ایک سردار ابو ربیعہ نے یہ طے کیا کہ ایک سال غلاف وہ چڑھایا کرے گا اور ایک سال کا غلاف قریش کا کوئی خاندان اپنی طرف سے چڑھائے۔

اس کے علاوہ زمانۂ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ عرب کے مختلف قبیلے اور قبائلی سردار جب زیارت کے لیے آتے تھے تو کعبے پر چڑھانے کے لیے طرح طرح کے پردے لاتے تھے۔ جتنے لٹکائے جا سکتے تھے اتنے لٹکا دیے جاتے اور باقی کعبے کے خزانے میں رکھ دیے جاتے تھے۔ جب کوئی پردہ بوسیدہ ہو جاتا تو اس کی جگہ دوسرا پردہ لٹکا دیا جاتا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کا واقعہ ہے کہ حضورؐ کی دادی کے ایک صاحبزادے (غالباً حضرت عباس بن عبدالمطلب) گم ہو گئے تھے۔ انہوں نے نذر مانی کہ اگر بچہ مل گیا تو وہ کعبہ پر ریشمی غلاف چڑھائیں گی۔ جب وہ مل گیا تو انہوں نے اپنی نذر پوری کی اور سفید رنگ کا ریشمی غلاف

کعبے پر چڑھایا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کعبے پر ریشم کا غلاف چڑھایا گیا۔

حضور کی نبوت سے پانچ سال پہلے جب قریش نے کعبے کی از سرِ نو تعمیر کی تو پورے قبیلے نے بڑے اہتمام سے کعبے پر غلاف چڑھایا۔

ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے کہ قبیلہ بنی تمیم کے ایک صاحب اپنی ماں کے ساتھ زیارتِ کعبہ کے لیے گئے تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اُس زمانے میں انہوں نے کعبے پر مختلف قسم کی اور مختلف رنگوں کی چادریں ٹنگی ہوئی دیکھی تھیں۔

فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ کا یہ اعلان کہ فلاں فلاں اشخاص اگر کعبے کے پردوں سے بھی لپٹے ہوئے ہوں تو انہیں قتل کر دیا جاتے، اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ اس وقت کعبے پر پردے لٹکے ہوئے تھے۔

فتح مکہ کے بعد جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ نے اعلان فرمایا تھا کہ آج وہ دن ہے جب اللہ کعبہ کی عظمت قائم فرمائے گا اور اب ہم اس پر غلاف چڑھائیں گے۔ اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک عورت غلافِ کعبہ کو خوشبو دینے کے لیے بخور جلا رہی تھی۔ اتفاقاً کپڑا آگ پکڑ گیا اور پورا غلاف جل گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے زمانۂ جاہلیت کا لبادہ کعبے پر سے خود اتار دیا اور پھر زمانۂ اسلام میں پہلی مرتبہ مسلمانوں نے اللہ کے گھر پر غلاف چڑھایا۔ یہ روایت علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں حضرت سعید بن المسیب سے نقل کی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ اپنے زمانے میں کعبے پر یمنی کپڑے کا غلاف چڑھاتے تھے۔ پھر جب مصر فتح ہو گیا تو حضرت عمر اور حضرت عثمان قباطی (مصری کپڑے) کا غلاف بنوانے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انہوں نے اپنے عہدِ خلافت میں غلاف چڑھایا ہے یا نہیں۔ اس بارے میں روایات خاموش ہیں۔ ممکن ہے کہ خلفشار نے آنجناب کو اس خدمت کا موقع نہ دیا ہو۔

قدیم زمانے سے یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ جب حج کے بعد سب حاجی رخصت ہو جاتے تھے تو ۱۰ محرم کو کعبے پر غلاف چڑھایا جاتا تھا۔ اسی طریقے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے

زمانے میں بھی عمل ہوتا رہا۔ امیر معاویہ نے اپنے عہد میں یوم عاشورا پر غلاف چڑھانے کے علاوہ ایک اور غلاف عید الفطر کے موقع پر بھی چڑھانا شروع کر دیا۔ یہ بات بھی روایات سے معلوم ہوتی ہے کہ زمانۂ اسلام میں سب سے پہلے امیر معاویہ نے ریشمی غلاف بنوایا تھا، پھر یزید اور حضرت عبداللہ بن زبیر نے اپنے اپنے زمانہ میں اس کی تقلید کی، اور عبدالملک بن مروان کے عہد سے یہی مستقل طریقہ بن گیا جو آج تک جاری ہے۔ اس عمل کی ابتدا جس وقت ہوئی تھی اس وقت بکثرت صحابہ و تابعین اور جلیل القدر فقہاء موجود تھے، کسی نے ریشمی غلاف پر اعتراض نہیں کیا۔ اس وجہ سے بعد کے علماء بھی اس کے جواز پر متفق رہے۔

زمانۂ اسلام سے پہلے مختلف لوگ کعبے پر چڑھانے کے لیے چادریں لایا کرتے تھے۔ اسلامی دور میں غلاف چڑھانا حکومت کی ذمہ داری قرار پا گیا۔ عبدالرزاق کی روایت کے مطابق ایک مرتبہ لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کیا ہم کعبے پر غلاف چڑھائیں؟ انہوں نے فرمایا اب تمہیں اس کی ضرورت نہیں رہی ہے، حکام نے تمہاری طرف سے اس خدمت کو سنبھال لیا ہے۔ ایک روایت میں حضرت عائشہ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں کہ "کسوۃ البیت علی الامراء" "بیت اللہ کا غلاف حکام کے ذمہ ہے"۔

عباسی خلافت کے زوال تک غلاف کی تیاری مرکزی حکومت کے انتظام میں ہوتی رہی۔ پھر جب کوئی مرکزی حکومت باقی نہ رہی تو مختلف علاقوں کے سلاطین اپنی طرف سے غلاف بنوا کر بھیجتے رہے اور بسا اوقات بیک وقت کئی کئی غلاف بھی چڑھائے گئے۔ اس سلسلہ میں ایک مرتبہ ہندوستان سے بھی ۴۶۶ھ میں غلاف بنوا کر بھیجا گیا تھا، اور چونکہ اس زمانے میں اسلامی حکومت اُن علاقوں تک محدود تھی جو اب پاکستان میں شامل ہیں، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ غلاف پاکستان سے بن کر گیا تھا۔

۷۵۰ھ میں مصر کے فرمانروا الملک الصالح اسماعیل بن ناصر نے غلاف کعبہ تیار کرانا اپنے ذمہ لیا اور اس غرض کے لیے تین گاؤں وقف کر دیئے۔ اس وقت سے موجودہ زمانے تک

مصر ہی سے غلاف بن کر آتا رہا ہے۔ مصر پر ترکی سلاطین کا قبضہ ہو جانے کے بعد سلطان سلیمان اعظم نے ملک الصالح کے اس وقف میں سات گاؤں کا اور اضافہ کر دیا اور اس عظیم وقف کی آمدنی سے ہر سال کعبہ کا غلاف، اور ہر پانچویں سال حجرۂ نبوی کے پردے اور منبر نبوی کا غلاف مصر سے بن کر آنے لگا۔ اس کے علاوہ کعبہ کے اندر کے پردے بھی وقتاً فوقتاً اسی وقف سے بنا کر بھیجے جاتے تھے۔ اُس زمانے میں اس وقف کی آمدنی ۸۲۳۶۶۷ درہم تھی جسے موجودہ زمانے کے مصری سکّے کے لحاظ سے ۵۰ ہزار اور ایک لاکھ مصری پاؤنڈ کے درمیان سمجھنا چاہیے۔ مگر جب پچھلی صدی کے آغاز میں مصر کے وائسرائے محمد علی پاشا نے ترکی سلطنت سے بغاوت کر کے خود مختاری اختیار کر لی تو اس نے یہ وقف منسوخ کر دیا اور صرف غلافِ کعبہ حکومت مصر کے خرچ پر بنوا کر بھیجنا شروع کر دیا۔ کعبے کے اندرونی پردے اور حجرۂ نبوی کے پردے آج تک مصر سے نہیں بھیجے گئے۔ آج جو پردے وہاں پڑے ہوئے ہیں وہ سب سلطان عبدالعزیز (۱۸۳۰۔ ۱۸۷۶ء) کے زمانہ کے ہیں اور بہت بوسیدہ ہو چکے ہیں۔ کعبے کا جو غلاف اب مصر سے بن کر آتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہزار مصری پونڈ کا ہوتا ہے۔

پہلے غلاف مختلف رنگوں کے ہوا کرتے تھے۔ مامون الرشید نے سفید رنگ کا غلاف چڑھایا تھا۔ محمود غزنوی کے غلاف کا رنگ زرد تھا۔ مصر کے فاطمی خلفا سفید رنگ کے غلاف بھیجتے تھے۔ خلیفہ ناصر عباسی (۵۷۵۔ ۶۲۲ھ) نے ابتدا میں سبز غلاف بنوایا تھا، پھر سیاہ ریشم کا بنوا کر بھیجا۔ اس کے بعد سے سیاہ غلاف ہی بنوایا جاتا رہا اور آج تک یہی طریقہ جاری ہے۔

غلافِ کعبہ کے چاروں طرف زری کے کام کی پٹی بنانے اور اس پر کعبہ کے متعلق قرآن مجید کی آیات لکھوانے کا سلسلہ سب سے پہلے ۷۶۱ھ میں مصر کے سلطان حسن نے شروع کیا تھا۔ اس کے بعد سے یہ پٹی لگانے کا طریقہ آج تک چل رہا ہے۔ اس پٹی پر حسب ذیل آیات لکھی جاتی ہیں:

ایک طرف ۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰھِیْمَ وَمَنْ دَخَلَهٗ کَانَ اٰمِنًا ۔ وَلِلّٰهِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ

مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ۔ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (آل عمران: ۹۶-۹۷)

دوسری طرف: جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْیَ وَالْقَلَآئِدَ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (المائدہ-۹۷)

تیسری طرف - وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (البقرہ: ۱۲۷-۱۲۸)

چوتھی جانب اس فرمانروا کا نام لکھا جاتا ہے جس نے غلاف بنوایا ہو۔

موجودہ صدی کے آغاز تک غلاف کعبہ دنیا کے سیاسی حالات سے غیر متاثر رہا۔ لڑائیاں ہوتی تھیں۔ سلطنتوں کے تعلقات بنتے اور بگڑتے تھے مگر کعبہ کے لیے غلاف جہاں سے آیا کرتا تھا وہیں سے آتا رہا۔ لیکن اس صدی کے آغاز میں دنیا کے سیاسی حالات اس پر بھی اثر انداز ہونے لگے۔ جنگ عظیم اوّل میں جب ترکی سلطنت جرمنی کے ساتھ شریک جنگ ہو گئی تو اسے اندیشہ ہوا کہ انگریز مصر سے غلاف کے آنے میں مانع ہوں گے۔ اس لیے اس نے استنبول سے ایک نہایت شاندار غلاف بنوا کر حجاز ریلوے کے ذریعہ سے مدینہ بھیج دیا۔ مگر چونکہ مصر سے عین وقت پر غلاف پہنچ گیا تھا اس لیے وہ ترکی غلاف مدینہ طیبہ میں محفوظ کر دیا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں شریف حسین اور حکومت مصر کے تعلقات خراب ہو گئے اور مصری حکومت نے عین حج کے موقع پر جدہ پہنچے ہوئے غلاف کو واپس منگوا لیا۔ خوش قسمتی سے اس وقت وہ ترکی غلاف کام آ گیا جو جنگ کے زمانہ میں ترکی حکومت نے مدینہ طیبہ بھیج رکھا تھا۔ پھر ۱۹۲۵ء میں سلطان ابن سعود اور شریف حسین کی لڑائی کے زمانے میں مصر سے غلاف نہ آیا اور ابن سعود نے عراق کا بنا ہوا ایک غلاف چڑھا دیا جو شریف حسین نے احتیاطاً بنوا کر رکھ چھوڑا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں ٹھیک یکم ذی الحجہ کو حکومت مصر نے غلاف بھیجنے سے انکار کر دیا اور ابن سعود کو فوراً مکہ میں ایک غلاف بنوانا پڑا۔ پھر ۱۹۲۸ء میں مصری غلاف نہ آیا اور امرتسر سے مولانا داؤد غزنوی اور مولانا اسماعیل غزنوی کے اہتمام میں غلاف بنوا کر بھیجا گیا۔ ان تجربات کی بنا پر اسی زمانہ میں مکہ معظمہ کے اندر ایک دار الکسوہ قائم کر دیا گیا تھا، تاکہ

مصر سے آئے دن غلاف نہ آنے کی مصیبت کا مستقل علاج کر دیا جائے۔ اس کارخانے میں مولانا اسمٰعیل غزنوی مرحوم کی مدد سے ہندوستان کے بہت سے کاریگر فراہم کیے گئے تھے۔ کچھ مدت تک وہیں غلاف تیار کیا جاتا رہا۔ پھر سعودی حکومت اور مصر کے تعلقات درست ہو گئے اور وہاں سے غلاف کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب پچھلے سال وہی قضیہ پھر پیش آیا اور سیاسی تعلقات کی خرابی نے مصری غلاف کی آمد کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک مدتِ دراز کے بعد اس سال پاکستان کی سرزمین پر غلاف کا کپڑا تیار ہو رہا ہے۔ پورے غلاف کے لیے ایک ہزار گز کپڑا درکار ہوتا ہے۔ پاکستان سے صرف یہ کپڑا ہی بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ زری کے کام کی پٹی مکہ معظمہ کے دار الکسوہ میں تیار کی جائے گی۔

"تفہیم القرآن" کا پشتو ترجمہ

شائقینِ تفہیم القرآن کے لیے یہ خبر موجبِ مسرت ہو گی کہ "تفہیم" کے پشتو میں ترجمہ اور اشاعت کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ پر مشتمل ۲۴۰ صفحات کی پہلی جلد عنقریب چھپ کر منظرِ عام پر آنے والی ہے۔ ہدیہ فی جلد صرف ڈھائی روپے، علاوہ محصول ڈاک۔ جو حضرات اپنے لیے ایک یا زائد نسخے یا مخیر حضرات مفت تقسیم کی غرض سے متعدد نسخے خرید کر اس کارِ خیر میں حصہ لینا چاہیں وہ اپنی فرمائشیں اور رقوم مولانا راحت گل صاحب، جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور کے نام ارسال فرما سکتے ہیں۔

اس گراں قدر تالیف کی اشاعت میں بعض مالی دشواریاں درپیش ہیں، اس لیے جو اصحابِ استطاعت اس میں پیشگی تعاون فرمائیں گے، انشاء اللہ اجرِ خیر کے مستحق ہوں گے

خاکسار غلام علی، معاون خصوصی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

دستورِ پاکستان کی آئینی، اخلاقی، اسلامی اور جمہوری حیثیت

(مندرجہ ذیل تقریر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، امیر جماعت اسلامی، پاکستان نے ۱۲ مارچ کو لاہور ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے ایک اجتماع میں ارشاد فرمائی)

حضرات! کسی دستور پر گفتگو کرنے کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ ہم محض اس کی دستاویز ہاتھ میں لے کر اس پر بحث شروع کر دیں۔ پہلے ہمیں اس کا تاریخی پس منظر دیکھنا چاہیے کہ وہ کس ملک میں کیسے حالات میں کس طرح بنا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ اس دستور کے پیچھے کوئی اخلاقی جواز بھی موجود ہے یا نہیں۔ کوئی قانون یا دستور جس کی پشت پر اخلاق کی طاقت نہ ہو، اگر محض سیاسی طاقت سے نافذ ہو بھی جائے تو انسانی ضمیر پر اس کی گرفت قائم نہیں ہو سکتی۔

ان دو امور کو پیش نظر رکھ کر جب ہم دستور کے مسئلہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ پاکستان کا ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی حیثیت سے وجود میں آنا کسی فردِ واحد یا کسی خاص گروہ کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے۔ دراصل متحدہ ہندوستان کی پوری مسلم قوم نے اس کے لیے جدوجہد کی، قربانیاں دیں اور بالآخر سلطنتِ برطانیہ کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ جو حاکمیت (SOVEREIGNTY) اُسے حاصل ہے اس سے وہ دستبردار ہو جائے۔ یہ دستبرداری برٹش پارلیمنٹ نے ایک باقاعدہ قانون کی شکل میں لکھ دی جسے انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ (قانون آزادئ ہند) کے نام سے دنیا جانتی ہے۔ اس ایکٹ کی رُو سے سلطنتِ برطانیہ کسی شخص یا گروہ کے حق میں دستبردار نہیں ہوئی تھی بلکہ باشندگانِ پاکستان کے حق میں دستبردار ہوئی تھی اور اس نے باشندوں کے نمائندوں پر مشتمل مجلس دستور ساز کو اس حاکمیت کا امین بنایا تھا۔ یہ ایک فطری اصول ہے کہ کسی صاحبِ حاکمیت طاقت کو جس نے حاکمیت سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا ہو وہی اس حاکمیت کا حقدار ہوتا ہے اور کسی دوسرے کو اسے بیچ میں سے

اُچک لینے کا حق نہیں ہوتا - برطانوی سلطنت سے اس حاکمیت کو کسی شخص کی طرف منتقل کرنا کسی درجے میں بھی صحیح ہو سکتا تھا تو وہ شخص قائد اعظم مرحوم ہو سکتے تھے جن کی قیادت میں پاکستان کی جنگ لڑی گئی تھی لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ حاکمیت ان کی طرف بھی منتقل نہیں ہوئی تھی بلکہ خود اُنہوں نے اسے باشندوں کی طرف منتقل کرایا تھا - اس لیے اصولاً باشندگانِ پاکستان کی نمائندہ مجلسِ دستور ساز ہی اس ملک کے لیے دستور بنانے کی آئینی اور اخلاقی حیثیت سے مجاز تھی۔

۱۹۴۷ء میں دستور سازی کے لیے جو مجلس بنی تھی اس نے ۱۹۵۴ء میں دستور کی تکمیل کر دی تھی اور وہ ۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ء کی تاریخ بھی اس کے نفاذ کے لیے مقرر کر چکی تھی مگر یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد اُس زمانے کے گورنر جنرل نے اکتوبر ۱۹۵۴ء میں اس مجلسِ دستور ساز کو توڑ دیا اور اس کا بنایا ہوا دستور رکھا رہ گیا - اگرچہ بعد میں فیڈرل کورٹ نے یہ فیصلہ دے دیا کہ گورنر جنرل کا یہ فعل قانوناً صحیح تھا اور ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ اب اس فیصلے کو قانونی اغراض کی حد تک تسلیم کریں، لیکن ہمیں یہ کہنے کا حق ہے کہ عدالت کا وہ فیصلہ صحیح نہ تھا - وہ گورنر جنرل اُس تاجِ برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے اِس منصب پر مقرر ہوا تھا جو حاکمیت کے اختیارات سے دستبردار ہو چکا تھا - حاکمیت کی حامل اس وقت دستور ساز اسمبلی تھی نہ کہ گورنر جنرل - اس لیے ایک صاحبِ حاکمیت ادارے کو وہ شخص جو حاکمیت کا حامل نہ تھا توڑنے کا کوئی حق نہ رکھتا تھا - وہ نہ تاجِ برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے اس کا مجاز تھا نہ اُس کو کسی درجے میں بھی قوم کی نمائندگی کے حقوق و اختیارات حاصل تھے، نہ تاجِ برطانیہ یا جمہورِ قوم میں سے کسی نے اس سے یہ کہا تھا کہ وہ دستور ساز اسمبلی توڑ دے اور اس کا بنایا ہوا دستور ردی کی ٹوکری میں ڈال دے - اس نے سراسر اپنی شخصی حیثیت میں اس فعل کا ارتکاب کیا تھا - اور اس ارتکاب میں وہ صرف اس وجہ سے کامیاب ہو گیا کہ حکومت کا نظم و نسق چلانا جن ملازمین کے ہاتھ میں تھا انہوں نے دستور اور جمہور اور پارلیمنٹ کے ساتھ وفاداری کرنے کے بجائے ایک شخص کے ساتھ وفاداری کی ــــ اگر وہ قوم اور اس کی جمہوریت اور

دستورِ مملکت کے وفادار ہوتے تو دستور ساز اسمبلی ٹوٹنے کے بجائے گورنر جنرل اپنے منصب سے رخصت ہو جاتا۔

اس کے بعد فیڈرل کورٹ کے فیصلے کے مطابق ایک نئی دستور ساز اسمبلی بنی، جسے قانونی طور پر حاکمیت کے آئینی اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ اس نے یہ اختیارات استعمال کر کے ۱۹۵۶ء کا دستور بنایا اور یہ دستور عملاً نافذ بھی ہو گیا۔ پھر ۱۹۵۸ء کے وسط میں انتخابات عام کے لیے فروری ۱۹۵۹ء کی تاریخ بھی مقرر کر دی گئی تاکہ عوام اپنے نمائندے منتخب کر کے عملاً حاکمانہ اختیارات کا استعمال شروع کر دیں۔ مگر یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد اکتوبر ۱۹۵۸ء کی ایک رات کو یکایک دستور منسوخ کر دیا گیا، پارلیمنٹ توڑ دی گئی اور ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ اس دستور کو جس شخص نے توڑا وہ دستور کا بنانے والا نہیں بلکہ دستور کا بنایا ہوا صدر تھا۔ وہ نہ دستور کو منسوخ کرنے کا مجاز تھا، نہ دستور کی منسوخی کے بعد اس کی کوئی حیثیت باقی رہ جاتی تھی جس کی بنا پر وہ ملک میں حکمرانی کے اختیارات استعمال کر سکے۔ اس کو دستور سے باہر جا کر حکومت کی مشینری چلانے والے ملازمین کو احکام دینے کا سرے سے کوئی حق حاصل نہ تھا اور نہ ملازمین کے لیے کسی طرح یہ جائز تھا کہ وہ اس کے کسی غیر دستوری حکم کی تعمیل کریں۔ لیکن یہاں پھر وہی صورت پیش آئی جو ۱۹۵۴ء میں پیش آئی تھی کہ سرکاری ملازمین نے دستور اور جمہور اور پارلیمنٹ، یا بالفاظ دیگر قوم اور ریاست کی وفاداری کے بجائے ایک شخص کے ساتھ وفاداری کی۔ اسی وجہ سے اس شخص کا یہ فرمان نافذ ہو گیا کہ دستور ختم، پارلیمنٹ برخاست اور ملک پر مارشل لا مسلط۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو دستور کے بجائے اس شخص کی صدارت ختم ہو جاتی جس نے دستور و قانون کے دائرے سے باہر جا کر اختیارات استعمال کرنے کی جسارت کی تھی۔

اس کے بعد مارشل لا کے زمانے ہی میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے بنیادی جمہوریتوں کے اسی ہزار نمائندوں سے یہ اختیارات طلب کیے کہ وہ ملک کے لیے جو دستور خود چاہیں بنا دیں۔ یہ

بات پیشِ نظر رکھیے کہ یہ اختیارات مارشل لاء کے زمانے میں مانگے گئے تھے، چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے مانگے تھے اور ان کو طلب کرتے وقت کوئی متبادل صورت نہیں رکھی گئی تھی کہ اگر لوگ یہ طلب کردہ اختیارات نہ دیں تو دوسرا چارۂ کار کیا ہے۔ لہٰذا ہر ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ اس مطالبے کے حق میں ووٹ نہ دینے کے معنی یہ ہوں گے کہ ملک پر ہمیشہ مارشل لا مسلط رہے گا اور اس ملک کو کبھی دستور نصیب نہ ہوگا۔ ان حالات میں جو اختیارات دیے گئے ان کی اخلاقی حیثیت بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ عقل اور انصاف کی حس رکھنے والا ہر انسان خود سمجھ سکتا ہے کہ ان کی حیثیت کیا ہے۔

پھر یہ اختیارات حاصل کر لینے کے بعد کسی شخص کو دستور کے مسئلہ پر زبان کھولنے کا حق نہیں دیا گیا۔ ایک فردِ واحد نے ملک کا دستور بنایا اور اس دستور کے عملاً نافذ ہو جانے تک پوری قوم کی زبان بند رکھی گئی۔

یہ تاریخی پس منظر اس حقیقت کو بالکل واضح کر دیتا ہے کہ سابق دستور کا منسوخ ہونا اور موجودہ دستور کا آئینِ مملکت قرار پا جانا اس بنا پر ایک امرِ واقعہ تو ضرور ہے کہ طاقت کے ذریعے یہ دونوں کام انجام پا چکے ہیں، لیکن کسی شخص کو بھی یہ امید نہ رکھنی چاہیے کہ قوم کا ضمیر اس امرِ واقعہ کو امرِ جائز کی حیثیت سے بھی تسلیم کرے گا۔ سارے واقعات دن کی روشنی میں سب کے سامنے گزرے ہیں۔ لوگوں نے کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے۔ لوگ نہ اپنی آنکھوں کو جھٹلا سکتے ہیں اور نہ عقل و فہم سے عاری ہیں کہ ان واقعات کے معنی نہ سمجھ سکتے ہوں۔

اب اصل دستور کی طرف آئیے۔ اس کے آغاز ہی میں یہ بات صاف صاف لکھی ہوئی ہمیں ملتی ہے کہ یہ دستور فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب نے پاکستان کے لیے بنایا ہے۔ کسی قوم کی عزت و آبرو کے لیے بجائے خود یہ بات ہی کچھ کم غارت گر نہیں ہے کہ قوم نے خود اپنے لیے دستور نہیں بنایا ہے بلکہ ایک فیلڈ مارشل نے اس کو دستور عطا کیا ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ یہ ضرور کہا گیا ہے کہ قوم کے دیے ہوئے اختیارات کی بنا پر انھوں نے یہ دستور بنایا ہے لیکن آخر

دنیا اندھی اور بہری تو نہیں ہے۔ کس کو معلوم نہیں ہے کہ یہ اختیارات کن حالات میں کس طرح لیے گئے تھے؟ کس سے یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ یہ دیے ہوئے اختیارات نہ تھے بلکہ لیے ہوئے اختیارات تھے؟ کون نہیں جانتا کہ جس قوم سے یہ اختیارات لیے گئے تھے اس کو آخر وقت تک دستور کے مسئلے میں زبان کھولنے کا حق نہیں دیا گیا؟

اس دستور کی قدر و قیمت کا صحیح طور پر اندازہ کرنے کے لیے ہمیں اسے دو پہلوؤں سے جانچنا چاہیے۔ ایک اسلامی پہلو اور دوسرے جمہوری پہلو۔ اسلامی پہلو سے یہ دستور انتہائی مایوس کن ہے اور ملت کی دینی آرزوؤں اور تمناؤں کی کسی طرح بھی ترجمانی نہیں کرتا۔

سب سے پہلے مملکت کا نام نئے دستور میں "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کے بجائے صرف جمہوریہ پاکستان رکھا گیا ہے۔ اگرچہ اب یہ اعلان ہوا ہے کہ اس غلطی کی تلافی نئی دستوری ترمیم سے کر دی جائے گی لیکن اول تو یہ بات قابلِ غور ہے کہ جو نام ایک دفعہ رکھا جا چکا تھا اس میں سے لفظ "اسلامی" نکالنے کی آخر کیا وجہ تھی۔ پہلے یہ نام نہ ہوتا تو بات نگاہوں میں اس قدر نہ کھٹکتی مگر جب اثبات کے بعد نفی کی جائے تو لامحالہ دلوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نفی کے پیچھے کیا محرکات کام کر رہے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اب اس غلطی کی تلافی کی بھی جا رہی ہے تو بے محابا یہ کہہ کر کی جا رہی ہے کہ عوام کی رائے کا لحاظ کر کے ایسا نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ حکمران گروہ خود ایسا کرنا مناسب سمجھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں حکمران گروہ اب یہاں اس ذہنیت کے ساتھ حکمرانی کر رہا ہے کہ قوم اور اس کی رائے اس کے نزدیک کوئی وزن نہیں رکھتی اور اس کا لحاظ کرنا حکمرانوں کی نگاہ میں ایک کمزوری ہے۔

اس کے بعد دستور میں یہ کہا گیا ہے کہ اسلام کے خلاف کوئی قانون نہ ہونا چاہیے۔ سابق دستور میں "اسلام" کے بجائے "قرآن و سنت" کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے، مگر اس دستور میں نہ صرف ایک جگہ بلکہ ہر جگہ قرآن و سنت کے الفاظ کو چھوڑ کر لفظِ اسلام استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسلام کے معتبر اور مسلّم مآخذ سے اجتناب کر کے کوئی خاص

اسلام یا اس کی کوئی خاص تعبیر نافذ کرنا پیشِ نظر ہے۔ ورنہ آخر کیا معقول وجہ ہے کہ قرآن و سنت کی تصریح سے ہر جگہ اجتناب کیا گیا؟ اس اجتناب کو دانستہ میں اس بنا پر کہنے پر مجبور ہوں کہ سابق دستور میں کتاب و سنت کی تصریح تھی اور اس دستور میں ان تمام مقامات پر ان کو چھوڑ کر صرف اسلام کا لفظ رکھ دیا گیا ہے۔ آخر ہم یہ کیسے مان لیں کہ یہ تغیر بے وجہ ہے۔

پھر یہ کہنا کہ اسلام کے خلاف کوئی قانون نہ ہونا چاہیے ایک منفی بات ہے۔ ایک حکومت جس کو وہ لوگ چلا رہے ہوں جو خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہوں، محض اس بات کی پابند نہیں ہوتی کہ اسلام کے خلاف کام نہ کرے، بلکہ وہ اس بات کی بھی پابند ہوتی ہے کہ اسلامی احکام کو نافذ کرے، جن چیزوں کو اسلام حرام کرتا ہے ان کو روکے اور انسانیت کی اصلاح کے لیے جو اسکیم اسلام نے دی ہے اس کو عمل میں لائے۔

سابق دستور میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ پہلے سے جو غیر اسلامی قوانین چلے آ رہے ہیں ان کو کتاب و سنت کے مطابق تبدیل کیا جائے گا۔ لیکن یہ دستور سابق قوانین کے بارے میں خاموش ہے۔

سابق دستور میں حکومت کی یہ ذمہ داری قرار دی گئی تھی کہ وہ قحبہ گری، شراب اور قمار بازی کو بند کرے گی۔ اس دستور میں ان چیزوں کی صرف حوصلہ شکنی (DISCOURAGE) کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاید اس کا مطلب یہ ہو کہ زناکاری کے اڈوں پر لائسنس فیس بڑھا دی جائے گی، شراب کی قیمت میں اضافہ کر دیا جائے گا، اور قمار بازی صرف کلبوں اور ریس کورس میں ہو سکے گی!

سابق دستور میں یہ کہا گیا تھا کہ "ربا" کا سدباب کیا جائے گا اور لفظ ربا کی کوئی تشریح نہیں کی گئی تھی۔ اس دستور میں لفظ ربا کے آگے قوسین میں یوژری (USURY) بڑھا دیا گیا ہے۔ اگرچہ لغت کے لحاظ سے لفظ انٹرسٹ اور یوژری دونوں سود اور ربا کے ہم معنی ہیں لیکن اب اصطلاحِ عام میں یوژری کا لفظ پٹھانوں اور مہاجنوں کی حد سے بڑھی ہوئی شرحِ سود کے لیے

استعمال کیا جاتا ہے اور صرف اسی کو بند کرنا غالباً دستور ساز کے پیش نظر ہے مدعا کی تشریح میں انٹرسٹ کے بجائے یوزری کا لفظ لکھنے کی کوئی دوسری وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

اس بات کا انتظام کرنے کے لیے کہ اسلام کے خلاف کوئی قانون سازی نہ ہو ایک مشاورتی کونسل دستور میں تجویز کی گئی ہے جسے نام زد کرنا صدر کے اختیار میں ہے۔ اس بظاہر مبارک تجویز کے پیچھے جو ارادہ کام کر رہا ہے اس کا اندازہ اُن اصحاب سے ہوتا ہے جن پر اس کونسل کی رکنیت کے لیے نگاہِ انتخاب پڑی ہے۔ اس انتخاب نے ایک خورد بینی اقلیت کو چھوڑ کر پوری قوم کو اس طرف سے مایوس کر دیا ہے کہ اس کونسل کی مدد سے اسلام کے خلاف کسی قانون سازی کا سدباب ہو سکے گا۔ بلکہ اس امر کا سخت اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ اب ہمیں اسلام کی نئی اور نرالی تعبیرات سے سابقہ پیش آئے گا۔

آئیے اب ذرا ہم جمہوریت کے نقطۂ نظر سے اس دستور کا جائزہ لیں۔ علم سیاست کی رُو سے ریاست کے تین بنیادی اجزاء ہوتے ہیں ایک انتظامیہ، دوسرے مقننہ اور تیسرے عدلیہ۔ اس دستور میں انتظامیہ کے جملہ اختیارات صدر کے سپرد کیے گئے ہیں اور اُن پر کسی نوعیت کی کوئی قدغن نہیں ہے۔ عدلیہ کو باشندوں کے بنیادی حقوق کی حفاظت کے اختیارات سے عملاً بے دخل کر دیا گیا ہے اور اب بظاہر اشک شوئی کے لیے بنیادی حقوق کے متعلق جو نئی دستوری ترمیم حکومت کی طرف سے آرہی ہے اس میں مارشل لا کے دور کے قوانین کو مستثنیٰ کر کے پوری ترمیم کو بے معنی بنا دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ریاست کا تیسرا جزو رہ جاتا ہے، یعنی مقننہ اس کے اختیارات کو طرح طرح سے محدود کر کے قانون سازی کی طاقت بھی درحقیقت اسی ہستی کی طرف منتقل کر دی گئی ہے جس کو انتظامیہ کے مکمل اختیارات دیئے گئے ہیں۔ یہ بات دستور کی حسب ذیل شقوں سے صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے۔

۱۔ صدر کے خلاف مذمت کی قرارداد، یا اس کو ذہنی اور جسمانی حیثیت سے نااہل قرار دینے کی تحریک کے متعلق دستور میں یہ طے کیا گیا ہے کہ اگر ایسی کسی تحریک کے حق میں ووٹ دینے

والے ارکان اسمبلی کی تعداد اس کے کل ارکان کی نصف تعداد سے کم ہو تو تحریک کے پیش کرنے والے ارکان آپ سے آپ اسمبلی کی رکنیت سے خارج ہو جائیں گے۔ جمہوری دستوروں میں یہ دفعہ بے نظیر ہے اور اس کی موجودگی میں مشکل ہی سے کبھی ایسی کوئی قرارداد یا تحریک لانے کی کوئی شخص جرأت کر سکتا ہے۔

۲۔ احتیاطی نظر بندی کے متعلق کوئی مسودۂ قانون یا کوئی ترمیم صدر کی پیشگی منظوری کے بغیر سرے سے مجلسِ قانون ساز میں لائی ہی نہیں جا سکتی۔

۳۔ بجٹ اور مالی مسوداتِ قانون کے بارے میں اسمبلی کے اختیارات اس قدر محدود کر دیئے گئے ہیں کہ مالیات کا بہت بڑا حصہ اس کے دائرۂ اختیارات سے خارج ہو جاتا ہے۔

۴۔ قانون سازی کے معاملہ میں یہ عجیب و غریب طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اگر اسمبلی کے پاس کیے ہوئے کسی قانون کو صدر منظور نہ کرے اور اسمبلی دوبارہ اس قانون کو کل ارکان کی ⅔ اکثریت سے پاس کر دے تب بھی صدر اس کی منظوری دینے کا پابند نہیں ہے۔ بلکہ اس پر بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں سے استصواب کرایا جائے گا اور کل ممبروں کی نصف سے زائد تعداد جب اس کے حق میں ووٹ دے گی تب کہیں وہ قانون پاس ہو سکے گا۔

۵۔ صدر کے جاری کردہ آرڈی نینسوں کے بارے میں اسمبلی کو صرف انہیں منظور یا نامنظور کرنے کے اختیارات ہیں، ان میں کسی ترمیم کے اختیارات نہیں ہیں۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ مارشل لا کے زمانے کے تمام آرڈی ننس، جن کے ذریعے سے انتظامیہ کو بے تحاشا اختیارات دیئے گئے تھے، اس دستور کی رُو سے آپ سے آپ قانون قرار پا گئے ہیں۔

۶۔ سب سے زیادہ عجیب و غریب طریقِ کار ترمیمِ دستور کے معاملے میں اختیار کیا گیا ہے۔ اگر اسمبلی کے کل ممبروں کی ⅔ تعداد دستور میں کوئی ترمیم پاس کر دے تو اسے صدر کے سامنے منظوری کے لیے پیش کیا جائے گا۔ صدر اگر اس کی منظوری نہ دے تو پھر اس کو پاس کرنے کے لیے کل ممبروں کی ¾ تعداد درکار ہوگی۔ مگر پھر بھی صدر اس کی منظوری دینے کا پابند نہیں ہے۔ اگر صدر

اس کو منظور نہ کرے تو تیسری مرتبہ اسمبلی کو ⅔ اور بعض حالات میں ¾ اکثریت سے پھر اسے پاس کرنا ہوگا۔ اس پر بھی اگر صدر اس کو منظور نہ کرے تو اس پر بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں سے ریفرنڈم کرایا جائے گا اور اس میں اگر اُن کی کل تعداد کا نصف سے زائد حصہ اس ترمیم کے حق میں ووٹ دے تب کہیں وہ ترمیم قانون کی شکل اختیار کرے گی۔

اس طرح مجلسِ قانون ساز کے اختیارات کو ہر طرف سے محدود کرنے کے بعد بھی یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ وزیروں اور پارلیمینٹری سیکرٹریوں کا ایک لشکر مجلس قانون ساز میں داخل کیا جائے تاکہ اسمبلی میں کم از کم اتنی تعداد صدر کے منشا کی پیروی کرنے والے ارکان کی موجود رہے جو کبھی کوئی قانون یا ترمیم دستور کا کوئی مسودہ صدر کی مرضی کے خلاف پاس نہ ہونے دے۔

کیا اس دستور کو کسی معنی میں بھی ایک جمہوری دستور کہا جا سکتا ہے؟ دراصل یہ نہ پارلیمانی جمہوریت ہے اور نہ صدارتی جمہوریت۔ یہ جمہوریت کے نام سے ایک آمریت ہے جو اس دستور کے ذریعے سے اس ملک میں قائم کی گئی ہے۔

اس ضمن میں یہ حقیقت پوری طرح ذہن نشین رہے کہ اس دستور میں عوام کو جس طریقہ سے بنیادی حقوق سے محروم کیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ باشندگانِ ملک آزادی سے متمتع ہو رہے ہیں۔ دراصل اب ہماری آزادی صرف ہمارے حکمرانوں کی آزادی ہے۔ نو کروڑ باشندگانِ ملک کی آزادی نہیں ہے۔ جن حقوق کو حاصل کرنے کے ذرائع سے لوگ محروم کر دیئے جائیں ان کو محض کاغذ پر لکھ دینا مقدس خواہشات سے بڑھ کر کیا قدر و قیمت رکھتا ہے۔

آخر میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ جمہوریت کی دو شکلیں دنیا میں مسلّم ہیں۔ ایک پارلیمانی اور دوسرے صدارتی۔ اگر صدارتی طرز کی جمہوریت یہاں نافذ ہو تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ جمہوریت نہ ہوگی۔ لیکن جو شخص بھی ہمارے ملک کے حالات پر نگاہ ڈالے گا اور ان دونوں طرز کی جمہوریتوں کے تجربات پر نگاہ رکھے گا وہ یہ ماننے میں

تامل نہ کرے گا کہ ہمارا ملک صدارتی جمہوریت کی عیاشی برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے۔

پارلیمانی جمہوریت میں جو پارٹی پارلیمنٹ کے اندر اکثریت رکھتی ہو، وہی انتظامی اختیارات کی حامل ہوتی ہے اور اسے پارلیمنٹ میں اپنے ان اختیارات کے متعلق جوابدہی کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ پارلیمنٹ کے ارکان کی اکثریت کو مطمئن نہ کر سکے تو حکومت کے اختیارات اس کے ہاتھ میں نہیں رہ سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پارلیمانی جمہوریت میں حکمران پارٹی کے ارکان کبھی اس حد تک ناجائز فائدے نہیں اٹھا سکتے جس کی نظیریں صدارتی جمہوریت میں مجلس قانون ساز کے ارکان پیش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس چونکہ صدارتی جمہوریت میں انتظامیہ کو قانون سازی اور بجٹ کے معاملے میں مجلس قانون ساز پر انحصار کرنا پڑتا ہے اس لیے وہ مجلس قانون ساز کے ارکان کو راضی رکھنے کے لیے بے تحاشا رشوتیں دینے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف یہ بات کافی ہے کہ ایک طرف ہمارے سامنے برطانوی پارلیمنٹ ہے جس کے ارکان کو ایک ہزار پاؤنڈ فی کس سالانہ الاؤنس ملتا ہے اور ساڑھے سات سو پچاس پاؤنڈ سالانہ اُن مصارف کے لیے دیئے جاتے ہیں جو پارلیمنٹ کے رکن ہونے کی حیثیت سے انہیں کرنے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف صدارتی جمہوریت کی بہترین مثال امریکی کانگریس ہے جس کے ہر رکن پر تقریباً ۹۸ ہزار پاؤنڈ سالانہ خرچ ہوتے ہیں۔ دوسرے تمام پہلوؤں کو چھوڑ کر صرف مالی حیثیت سے ہی دیکھ لیا جائے تو کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ ہمارا ملک جمہوریت کی صدارتی شکل کو برداشت کرنے کے قابل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک بگڑے ہوئے پارلیمانی نظام میں بھی حکمران پارٹی اپنی اکثریت برقرار رکھنے کے لیے ممبروں کو سیاسی رشوتیں دیتی ہے جس کی بدترین نظیریں ہماری آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔ لیکن صدارتی نظام چلانے کے لیے جو رشوتیں دی جاتی ہیں ان سے پارلیمانی نظام کی رشوتوں کو کوئی نسبت نہیں ہے۔

نبوّت کی ضرورت

(۷)

(عبدالحمید صدیقی)

اس مضمون کی گزشتہ چھ اشاعتوں میں ہم اس حقیقت کی واضح طور پر نشاندہی کر چکے ہیں کہ انسان کے داخلی تجربات، اُس کے مشاہدات، اُس کی عقلی اور فکری قوتیں ان میں سے کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو انسان کی ہدایت اور رہنمائی کا پورا پورا انتظام کر سکے۔ علم کے یہ سارے ماخذ بلاشبہ انسانیت کے لیے بے حد مفید اور کارآمد ہیں۔ ان کی مدد سے انسان انفس و آفاق پر غور کر کے نہایت ہی مفید معلومات حاصل کرتا ہے۔ پھر ان معلومات کو ایک خاص انداز میں ترتیب دے کر ان سے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح اس کے وجدان کے اندر نکھار، اُس کے مشاہدات میں وسعت اور فہم و فراست میں صحت اور اعتدال پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ یہ سارے تجربات خواہ کتنے مفید ہوں اور فہم و ادراک کی حد خواہ کتنی وسیع ہو جائے انسان وحی و الہام کی ضرورت سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

انسان کے مادّی وجود کا تانا بانا چونکہ عناصر طبیعی کے مجموعہ سے عبارت ہے، اس لیے ان عناصر کی تاریکی سے وہ کبھی از خود نجات نہیں حاصل کر سکتا۔ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے اس بات پر مجبور ہے کہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرے۔ اس تاریکی سے نکلنے کی ایک ہی صورت ممکن ہے کہ کوئی زبردست شخصیّت وحی و الہام کی شمع ہاتھ میں لے کر اس کی رہنمائی کرے اور ہر شخص اس کی قیادت پر اعتماد کرتے ہوئے اُس کی پیروی پر آمادہ ہو جائے۔

انسان کا کونسا ایسا تجربہ ہے جس کے متعلق وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہو کہ اُس پر اس کے مادی وجود کی پرچھائیں بالکل نہیں پڑ رہی ہیں۔ اس ضمن میں حیاتِ انسانی کا جو شعبہ اس امر کا سب

زیادہ دعویدار ہو سکتا ہے وہ روحانی تجربات کا وہ گوشہ ہے جس میں ایک شخص عبد اور معبود کے درمیان وجدانی رشتہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اگر آپ ان لطیف تجربات کا بھی ذرا گہری نظر سے جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ عناصر طبیعی کی تاریکیاں اس خالص روحانی گوشے میں بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں اور ہر مرحلہ پر ان روحانی کیفیات کو اپنے کثیف تاثرات سے گدلا کرنے کے لیے بیتاب رہتی ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو انسان کے ان تجربات میں جو حرص و ہوا کے سارے بندھنوں سے آزاد ہوتے ہیں، کوئی اختلاف نظر نہ آتا لیکن اس پاکیزہ اور مقدس راہ کے سالکین کے مابین بھی خواہ تلخی نہ ہو، لیکن مقام من و تو تو ضرور ہی آجاتے ہیں۔ منصور کا نعرہ انا الحق یا گڈریے کا عقیدہ تجسیمیت و تشبیہیت جس کا قصہ مولانا روم نے لکھا ہے اس اختلاف کی واضح مثالیں ہیں۔

دوسرے یہ روحانی واردات، سراسر داخلی تجربات ہونے کی وجہ سے ایک ۔ فرد کے لیے کیف و مستی کا سامان تو مہیا کر سکتی ہیں لیکن ان واردات کو خارجی زندگی میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ اسی وجہ سے یہ واردات خواہ کتنی ہی پُر کیف ہوں اور سوز و گداز سے مملو، لیکن ان سے کسی تمدن کی تعمیر یا کسی معاشرے کی تشکیل کا کام نہیں لیا جا سکتا۔

یہی حال انسانی مشاہدات کا ہے۔ انسان جب بھی کسی چیز کو دیکھتا ہے تو وہ خاص عینک سے دیکھتا ہے اور اس عینک کے شیشوں پر اُس کی ذاتی خواہشات اور تمناؤں کے عکس ہمیشہ پڑتے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ حقیقت کا اُس کے اصل رنگ میں کبھی مشاہدہ نہیں کر سکتا پھر اُس کے مادی وجود کی حدود و قیود یہاں بھی ہر گام پر اُس کے راستے میں مزاحم ہوتی ہیں۔ اُس کی نگاہ سے "برق و بخارات" کا کوئی گوشہ اوجھل نہیں رہتا لیکن لطیف احساسات اور پاکیزہ جذبات کی وسیع و عریض دنیا جس میں قدم رکھ کر انسان انسانیت کے شرف سے نوازا جاتا ہے، وہ بہر حال اس کے حدادراک سے دُور ہی رہتی ہے۔

انسانی رہنمائی کا تیسرا مدعی عقل ہے لیکن عقل بھی اس معاملے میں اتنی ہی ناکام ہے

جتنی کہ دوسری انسانی قوتیں اور اس کی ناکامی کا سبب بھی وہی ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں یعنی اُس کے جسم کا خمیرہ چونکہ مادی عناصر سے اٹھایا گیا ہے اس لیے ان عناصر کی تاریکیاں انسان کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو کافی حد تک متاثر کرتی ہیں۔ اس کی حسی آرزوئیں اور تمنائیں، اُس کی مادی خواہشات اور امنگیں اس کی فکری پرواز کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ اور اس طرح عقل کا طائر مادی دنیا کے خم و پیچ میں ہی اُلجھ کر اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔

انسانی رشد و ہدایت کے ان تینوں دعویداروں میں کوئی ایک دعویدار بھی ایسا نہیں جو اسے مادہ کے طلسم ہوشربا سے نکال کر اُس کی اس انداز سے نشو و نما کرے کہ اُس کے مادی وجود کو غذا فراہم بھی ہوتی رہے لیکن یہ غذا بالآخر اس کی روحانی ترقی کا ذریعہ ثابت ہو۔ انسان نے زندگی گزارنے کے لیے آج تک جتنے فلسفے گھڑے ہیں وہ سارے کے سارے نامکمل اور یک رُخے ہیں۔ انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ احساسات و جذبات کی دنیا مشاہدات کی دنیا سے یکسر الگ ہے اور اسی طرح ٹھوس اور وزن دار تعقلات کی دنیا کا دوسری دنیاؤں سے کوئی تعلق اور رابطہ نہیں اور قدرت کے یہ تین الگ الگ کارخانے ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق ہو کر اپنا فرض سرانجام دے رہے ہیں۔ انسان کی نافری کیفیت جبکہ وہ عبد اور معبود کے درمیان وجدانی رشتہ قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے ایک داخلی کیفیت ہے جس کے لیے کوئی منطقی بحث مفید نہیں ہو سکتی۔ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ عقل کی میزان پر تول کر کبھی نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ کیفیت ایک خاص قسم کی بصیرت افروزی ہے، جس کے زیر اثر دیدۂ دل وا ہو جاتا ہے اور کان نوا ہائے روز کے محرم ہو جاتے ہیں۔ ان حالتوں میں غایت درجہ کی تحلیت اور معنویت پیدا ہوتی ہے جس کے ادراک سے عقل سراسر عاجز ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان نے ان روحانی کیفیات میں عقلی عنصر داخل کرنے کی مختلف کوششیں کی ہیں اور انسان جب تک انسان ہے اپنے ہر کام اور فعل کے لیے عقلی بنیاد فراہم کرتا رہے گا لیکن "روحانیت" کو علمیت اور فلسفہ

کی خراد پُر اتارنے کی کوشش کے باوجود، نفسیاتِ تصوف کا مطالعہ انسان کو جس نتیجہ پر پہنچاتا ہے وہ یہی ہے کہ "حاسۂ روحانی" ہمیشہ ہر شخص کی جذبی اور تاثری حیات شاعرہ کا ایک سربستہ راز ہے اور سراسر ایک انفرادی اور شخصی چیز ہے۔ اس کی جڑیں اگر کہیں ملیں گی تو صرف تاثرات کی گہرائیوں میں۔ فلسفہ کی حیثیت زیادہ سے زیادہ وہی ہے جو ایک متن کے غیر زبان میں ترجمے کی ہوتی ہے۔ جس کی مدد سے ایک شخص مفہوم کو تو پا لیتا ہے لیکن وہ الفاظ کے حسن، ان کی صوتی ہم آہنگی اور اُن کی گہری معنویت سے حظ اٹھانے کے قابل نہیں ہوتا۔ عقلیت کے خشک میدانوں میں حاسۂ روحانی کی تلاش ایسی ہے جیسی کہ آنکھوں سے سننے کی کوشش کرنا۔ زندگی کی علمی تحقیق اور تدقیق اور چیز ہے اور اس زندگی کے جیتے جاگتے، ابلتے سرجیون چشمہ تک پہنچنا بالکل ہی دوسری چیز ہے۔

علم را بر دل زنی یارے بود

علم را بر تن زنی بارے بود

غرض روحانیت کی اساس "سوز و گداز" ہے اور اس شعبۂ حیات میں عقل کی دخل اندازی سراسر ایک تکلف۔ عقل اپنی ساری وسعتوں اور قوتوں کے باوجود زندگی کے اس اہم گوشہ کی نقاب کشائی سے ہمیشہ عاجز رہی ہے۔ اُس نے بیلے جا جسارت سے کام لیکر کبھی اس شعبہ کی افادیت اور اہمیت سے انکار تو کر دیا ہے لیکن اس امر کا دعویٰ نہیں کیا کہ وہ من کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے میں کامیاب ہوئی ہے۔ کیونکہ یہ کام اس کے احاطۂ اختیار سے باہر ہے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے بالِ جبریل میں عقل کی بے بسی کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے ؎

خرد سے راہرو روشن بصر ہے	خرد کیا ہے چراغِ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا	چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے

عقل کی ساری تگ و تاز زندگی کے خارجی معاملات تک محدود ہے۔ انسان کی

داخلی دنیا جو خارجی ہنگاموں سے کہیں زیادہ وسیع ہے، وہ اس کی حد ادراک سے ماورا ہے۔ اگر کسی شخص کو عقل کے اس عجز کا اندازہ لگانا مقصود ہو تو وہ ذرا مغربی تہذیب و تمدن کا مطالعہ کرے اور دیکھے کہ اس تہذیب کے زیر اثر آکر انسانی زندگی کے اندر کتنی یک رخی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ ایک طرف ستاروں پر کمندیں ڈالنے کے لیے فکر مند ہے لیکن دوسری طرف داخلی زندگی کے بنیادی محرکات تک سے قطعاً نا آشنا۔

عشق ناپید خرد مے گزدش صورتِ مار
عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

علامہ اقبالؒ نے جدید انسان کے اس تضاد کو اپنی شہرۂ آفاق کتاب "اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید" میں بھی واضح کیا ہے۔ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا ہے:

"عصر حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مترتب ہوئے ان کے زیر اثر انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ خیالات اور تصورات کی جہت سے دیکھیے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے متصادم ہے۔ سیاسی اعتبار سے نظر ڈالیے تو افراد افراد سے برسر پیکار ہیں۔ اس میں اتنی سکت ہی نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور ناقابل تسکین جوع زر پر قابو حاصل کر سکے۔ یہ باتیں ہیں جن کے زیر اثر زندگی کے اعلیٰ مراتب کے لیے اس کی جدوجہد بتدریج ختم ہو رہی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ درحقیقت زندگی ہی سے اکتا چکا ہے۔ اس کی نظر حقائق پر ہے یعنی حواس کے اس سرچشمہ پر جو اس کی آنکھوں کے سامنے ہے، لہٰذا اس کا تعلق اپنے اعماق وجود سے منقطع ہو چکا ہے

اور پھر جیسا کہ ہکسلے کو بھی خدشہ تھا اور جس کا بہ تاسف وہ اظہار بھی کر چکا ہے، مادیات کے اس باقاعدہ نشو و نما نے اس کے رگ و پے بھی مفلوج کر دیئے ہیں۔"

جس طرح تنہا عقل انسان کے اندر لطیف احساسات پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتی بالکل اسی طرح انسان کی روحانی اور وجدانی کیفیات میں یہ طاقت نہیں کہ وہ از خود اُن کے اندر معروضیت پیدا کر کے انہیں دنیا کے سامنے ایک معیار حق و باطل کی حیثیت سے پیش کر سکے۔ "کشف و مشاہدہ" کے ایک مشہور راز داں نے اپنی کتاب تلاش حق میں اس حقیقت کا بڑے واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے:

"روحانی کیفیات صرف ان لوگوں کے لیے اپنے اندر جواز کا پہلو رکھتی ہیں جو ان سے لذت آشنا ہوں۔ . . یہ واردات قلبی ان حضرات کے لیے بصیرت افروز حقائق ہیں جنہیں خود ان کا تجربہ ہو چکا ہو"

لیکن وہ لوگ جن کا اس پُر اسرار وادی میں کبھی گزر نہیں ہوا اُن کے لیے ان لطیف تجربات کی معنویت محلِ نظر ہے۔

اس راہ کے بعض پُرجوش سالکین نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ صوفیانہ اینیت نفسی بھی کم از کم ہماری نفسی ترکیب میں وہی درجہ رکھتی ہے جو دوسری شعوری کیفیت اور اُنکی حکمیت و قطعیت ویسی ہی ہے جیسے ہمارے دوسرے قسم کے شعوری تجربات کی۔ جب ہم خود اپنے نام نہاد عقل کے ذریعے حاصل کیے ہوئے معتقدات کا جائزہ لیتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اسی قسم کی حقیقت پر مبنی ہیں جو صوفیانہ خیالات کی بنیاد ہے۔

آپ اگر اس دعوے کا ذرا گہرائی میں اتر کر مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ دعویٰ کافی حد تک محلِ نظر ہے۔ صوفیانہ مشاہدات اور واردات عقلی تجربات سے کہیں زیادہ بیش قیمت ہی سہی لیکن یہ بہر حال شخصی و قلبی واردات ہی ہیں اور اس بنا پر ان کے اندر وہ معروضیت نہیں آ سکتی جو انہیں دوسرے لوگوں کیلئے حجت بنا سکے۔ اس ضمن میں اگر تفصیل درکار ہو تو ولیم جیمز کی کتاب "مذہبی تجربات کی گوناگونی" ملاحظہ فرمائیں۔ اس قابل قدر کتاب کے ایک باب "تصوف" میں اس موضوع

پر بڑی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی نے مکتوبات میں بھی اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے۔

صوفیانہ مشاہدات کے برعکس عقلی تجربات میں ایک حد تک معروضیت تو دکھائی دیتی ہے لیکن وہ اُن لطیف عناصر سے یکسر عاری ہوتے ہیں جنہیں انسانیت کی جان کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس میں انسان اپنے آپ کو ایک عجیب و غریب کشمکش میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ اگر وہ قلبی واردات کی طرف متوجہ ہو کر خارجی زندگی اور اس کے تقاضوں سے منہ موڑتا ہے تو اس کی تمدنی اور اجتماعی زندگی برباد ہو سکتی ہے اور اگر وہ صرف عقل پر اعتماد کر کے زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے تو یہ رہنما چند قدم کے بعد ہی رہزن بن کر اس کی دل کی دولت لوٹنے کے درپے ہو جاتا ہے۔ اُس کی متاعِ ایمان پر ڈاکہ ڈالتا ہے، اُس کے یقین کو غارت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ الغرض وہ اس بدنصیب انسان کو انسانیت کے ہر اس امتیاز سے محروم کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ہے۔ انسان کی اسی بے چارگی کا ذکر کرتے ہوئے فلسفۂ مذہب کے ایک مشہور مفکر جان کارڈ نے کہا ہے:

> "اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مذہب کی بنیاد صرف جذبہ و احساس پر ہے تو پھر کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر فوقیت حاصل نہیں رہتی کیونکہ جس قسم کے روحانی مشاہدہ سے مجھے سرور حاصل ہوتا ہے وہی میرے نزدیک صحیح اور برحق ہے۔
> یہ مشاہدہ جو سراسر ایک داخلی کیفیت ہے اور جس میں ہر آن تغیر و تبدل ہوتا ہے کبھی بھی ایک آفاقی اور عالمگیر نظریہ کی اساس نہیں بن سکتا۔
> حق کو باطل سے ممیز اور ممتاز کرنے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ہمارے سامنے کوئی ایسا معروضی معیار ہو جس کی مدد سے ہم غلط اور صحیح کے درمیان تفریق کر سکیں۔ یہ معروضی معیار عقل ہی فراہم کر سکتی ہے"[1]

---

[1] فلسفۂ مذہب، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵

لیکن اسی مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ اگر معروضی اقدارِ حیات کے حصول کے لیے ہم صرف عقل پر بھروسہ کریں تو ہم انسانیت کے اُس لطیف اور شیریں عنصر سے دست کش ہو جاتے ہیں جو درحقیقت انسان کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس امر کی صراحت کرتے ہوئے جان کارڈ لکھتا ہے:

"انسان فطری طور پر اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ وہ منطق اور سائنس کی مدد سے معرفتِ الٰہی حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ علوم ایک فرد کے اندر فکر و نظر کی اعلیٰ سے اعلیٰ صلاحیتیں تو پیدا کر سکتے ہیں۔ ان کی وجہ سے ذہن جلا پاتا ہے، مشاہدہ میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ وہ مختلف نظریات اور افکار کے درمیان مقابلہ اور موازنہ کے نئے نئے انداز سیکھتا ہے اور اس طرح اس کی فطانت کی تہذیب و ترقی ہوتی ہے ... لیکن فکر و نظر کی ان ساری قوتوں کے باوجود وہ ایمان کے لطیف عنصر سے بہرحال محروم رہتا ہے۔ اس کا دل اس روحانی کیف و مستی سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا جو مذہب کی جان ہے، اور جس کی وجہ سے اُس کے اندر نیکی اور بھلائی کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔"[1]

(باقی)

[1] فلسفۂ مذہب ص ۱۵

رسائل و مسائل

لفظ "مشرک" کا اصطلاحی استعمال

سوال - آپ کے رسالہ "ترجمان القرآن" بابت ماہ مارچ ۱۹۶۲ء کا باب "رسائل و مسائل" مطالعہ کیا۔ مضمون کی آخری سطور سے مجھے اختلاف ہے۔ لہٰذا رفع اختلاف اور جستجوئے حق کے جذبہ کے تحت سطور ذیل رقم کر رہا ہوں:

کتاب و سنت کی واضح تصریحات سے مترشح ہوتا ہے کہ عالم ماکان و ما یکون اور "حاضر و ناظر ہونا" اللہ جل شانہٗ کی مختص صفات ہیں۔ بنا بریں جو مسلمان ان صفات مخصوصہ کا وجود حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم یا کسی اور نبی یا ولی میں تسلیم کرے تو کتاب و سنت کے قطعی فیصلے کی رو سے وہ شرک کا مرتکب متصور ہوگا اور اس پر لفظ "مشرک" کا عدم اطلاق کتاب و سنت کے احکام سے روگردانی کے مترادف ہوگا۔ ایسے شخص کو مشرکین عرب سے تشبیہ دی جائے، تو یہ تشدد نہیں بلکہ عین مقتضائے انصاف ہے۔

آخر یہ کیا بات ہوئی کہ ان صفات کا غیر اللہ میں تسلیم کرنا تو آپ کے نزدیک شرک ہو مگر اس شرک کا مرتکب مسلمان، اور اس پر "مشرک" کے لفظ کا اطلاق آپ کے نزدیک صریح تشدد! یہ تناقض کیوں؟

آپ کسی مسلمان کو مشرک فوراً اس لیے نہیں دیتے کہ اوّلاً وہ "تاویل کی غلطی" کا شکار ہوتا ہے۔ ثانیاً وہ شرک کو شرک جانتے ہوئے اس کا ارتکاب نہیں کرتا۔ آپ کی

یہ دونوں توجیہات میرے خیال میں مبنی بر صداقت نہیں ہیں۔

جواب میں نے جس قدر بھی قرآن مجید کا مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر وہ شخص جو شرک کا ارتکاب کرے، یا جس کے عقیدہ و عمل میں شرک پایا جاتا ہے، اس کو نہ اصطلاحاً "مشرک" کا خطاب دیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے ساتھ مشرکین کا سا معاملہ کیا جا سکتا ہے۔ اس خطاب اور اس معاملہ کے مستحق صرف، وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک شرک ہی اصل دین ہے، جو توحید کو بنیادی عقیدے کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتے، اور وحی و نبوت اور کتاب اللہ کو سرے سے ماخذِ دین ہی ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے خود یہود و نصاریٰ کے ارتکابِ شرک کا ذکر فرمایا ہے مثلاً وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ (التوبہ ۳۰) مثلاً لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ . . . . لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ (المائدہ ۷۲-۷۳) لیکن اس کے باوجود قرآن مجید میں ان کے لیے مشرکین کی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی بلکہ ایک دوسری اصطلاح "اہلِ کتاب"، ان کے لیے الگ وضع فرمائی گئی۔ پھر ان میں اور مشرکین میں صرف یہ لفظی فرق ہی نہیں رکھا گیا بلکہ ان کے ساتھ اہلِ ایمان کا معاملہ بھی مشرکین سے مختلف تجویز فرمایا گیا۔ اگر ان کو واقعی مشرک قرار دیا گیا ہوتا تو ولا تنکحوا المشرکات حتّٰی یؤمنّ کے تحت ان کی عورتوں سے نکاح آپ سے آپ حرام ہو جاتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے کتابیات کا حکم مشرکات سے بالکل الگ رکھا اور ان سے نکاح کی مسلمانوں کو اجازت دے دی۔ اسی طرح ان کے ذبائح کا حکم بھی مشرکین کے ذبائح سے مختلف رکھا۔ اس کی وجہ آخر اس کے سوا کیا ہے کہ شرک میں مبتلا ہو جانے کے باوجود وہ توحید ہی کو اصل دین مانتے تھے اور نبوت و کتاب ہی کو ماخذِ دین تسلیم کرتے تھے۔ اسی بنا پر تو ان سے فرمایا گیا کہ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ (آل عمران ۶۴) اور وَقُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنزِلَ إِلَيْنَا وَأُنزِلَ إِلَيْكُمْ وَإِلَٰهُنَا وَإِلَٰهُكُمْ وَاحِدٌ (العنکبوت ۴۶)

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے "مشرک" کی اصطلاح اُن لوگوں کے لیے استعمال فرمائی جو شرک ہی کو اصلِ دین مانتے تھے، جن کا اعتراض ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پر یہ تھا کہ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ (ص: ۵)، اور جنہیں یہ بات سرے سے تسلیم ہی نہ تھی کہ دین کے عقائد و اعمال وحی و رسالت سے ماخوذ ہونے چاہییں۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (البقرہ - ۱۷۰)۔ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ "مشرک" کا نام دیا، بلکہ اہلِ ایمان کا معاملہ ان کے ساتھ اہلِ کتاب سے مختلف رکھا۔

یہ حقائق چونکہ میری نگاہ میں ہیں اس لیے میں یہ بات قطعی جائز نہیں سمجھتا کہ اُن لوگوں کو "مشرک" کہا جائے اور مشرکین کا سا معاملہ اُن کے ساتھ کیا جائے جو کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے قائل ہیں، قرآن کو کتاب اللہ اور سند و حجت مانتے ہیں، ضروریاتِ دین کا انکار نہیں کرتے، شرک کو اصلِ دین سمجھنا تو درکنار، اپنی طرف شرک کی نسبت کو بھی بدترین گالی سمجھتے ہیں، اور اس کے بعد تاویل کی غلطی کے باعث کسی مشرکانہ عقیدے اور عمل میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ وہ شرک کو شرک سمجھتے ہوئے اس کا ارتکاب نہیں کرتے بلکہ اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ ان کے یہ عقائد و اعمال **عقیدۂ توحید** کے منافی نہیں ہیں۔ اس لیے ہمیں ان پر کوئی بُرا لقب چسپاں کرنے کے بجائے حکمت اور استدلال سے ان کی یہ غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ آپ خود سوچیں کہ جب آپ اِس طرح کے کسی آدمی کے سامنے اس کے کسی عقیدے یا عمل کو توحید کے خلاف ثابت کرنے کے لیے قرآن و حدیث سے استدلال کرتے ہیں تو کیا آپ کے ذہن میں یہ نہیں ہوتا کہ وہ قرآن و حدیث کو سند و حجت مانتا ہے؟ کیا یہ استدلال آپ کسی ہندو یا سکھ یا عیسائی کے سامنے بھی پیش کرتے ہیں؟ پھر جب آپ اس سے کہتے ہیں کہ دیکھو، فلاں بات شرک ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے، تو کیا آپ اُس وقت یہ نہیں سمجھ رہے ہوتے کہ یہ شرک کے گناہِ عظیم ہونے کا قائل ہے؟ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آخر آپ اس کو شرک سے

ڈرانے کا خیال ہی کیوں کرتے؟

ڈاڑھی اور فوجی ملازمت

سوال: مَیں نے ایرفورس میں پائلٹ کے لیے امتحان دیا تھا۔ میڈیکل ٹسٹ اور انٹرویو کے بعد بحمداللہ امتحان اور کھیلوں میں بھی کامیاب ہُوا۔ مگر بغیر وجہ بتلائے ہوئے مجھے مسترد کر دیا گیا۔ اب کئی لوگوں نے مجھے بتایا کہ تم صرف ڈاڑھی نہ منڈوانے کی وجہ سے رہ گئے تھے۔ مگر مجھے یقین نہ آیا۔

اب دسمبر میں مَیں نے پی، ایم، اے کے لیے امتحان دیا پہلے انٹرویو میں کمیٹی کے ایک بریگیڈیر صاحب نے مجھے بتایا کہ تم پہلی دفعہ کوہاٹ میں صرف ڈاڑھی کی وجہ سے رہ گئے تھے۔ اور یہ بھی کہا کہ پاکستانی فوج کے افسر ڈاڑھی والے کیڈٹ کو پسند نہیں کرتے اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایسا کوئی آدمی نہ لیا جائے۔ ہاں بعد میں اجازت لے کر ڈاڑھی رکھی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد مَیں نے تحریری امتحان دیا اور اس میں کامیاب ہُوا۔ اب اس کے بعد میڈیکل ہوگا اور اس کے بعد کوہاٹ جانا پڑے گا۔ اس وجہ سے میرے پانچ بھائی اور اب والد صاحب پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ ڈاڑھی کو صاف کراؤ مگر میں عزت، عہدے اور روپے کے لیے ایسا کام کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ میں اپنی اصلی حالت میں رہ کر یا تجارت کروں گا اور یا مزید تعلیم حاصل کر کے اسلام کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ ان ملازمتوں سے میرے مذہبی احساسات مجروح ہونگے۔ میں زیادہ دیر تک صبر نہیں کر سکتا۔ مگر قبل اس کے کہ آخری فیصلہ کروں، میں آپ سے مشورہ لینا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ کتاب و سنت کی روشنی میں میری رہنمائی کریں۔ میں آپ کا بہت ممنون ہونگا۔

جواب :- آپ نے جو حالات لکھے ہیں انہیں پڑھ کر انتہائی افسوس ہوا۔ پاکستان کی فوج اور فضائیہ میں آج بھی بکثرت ایسے لوگ موجود ہیں جو تقسیم سے قبل متحدہ ہندوستان کی فوج یا فضائیہ میں سکھوں کے ساتھ، بلکہ بعض تو اُن کے ماتحت کام کر چکے ہیں۔ ان کو خوب معلوم ہے کہ رعب، خوبصورتی، چستی اور دوسرے جن جن پُر فریب الفاظ کو استعمال کر کے آج یہ لوگ ڈاڑھی کو فوج اور فضائیہ میں حرام کیے ہوئے ہیں، ان میں سے کوئی حیلہ اور بہانہ نہ تو سکھوں سے ڈاڑھی منڈوا سکا اور نہ کسی بڑے سے بڑے عہدے تک ان کے پہنچنے میں مانع ہو سکا۔ آج بھی متحدہ ہندوستان کی فوج اور بحریہ اور فضائیہ میں سکھ بڑے سے بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور کسی کی یہ جرأت نہیں ہے کہ ان سے یہ کہہ سکے کہ تمہیں ملازمت کرنی ہے تو ڈاڑھی منڈوا کر آؤ، یا اگر تم ڈاڑھی رکھو گے تو تمہیں ملازمت میں نہ لیا جائے گا۔ ابھی تھوڑی ہی مدت پہلے ہمارے ہاں کی ایک فوجی تقریب میں حصہ لینے کے لیے ہندوستان سے ایک سکھ لفٹیننٹ جنرل آیا تھا جس کے چہرے پر بالشت بھر کی ڈاڑھی لٹک رہی تھی اور اس کی تصویر ہمارے ملک کے اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ افسوس کہ اس کو دیکھ کر بھی ہمارے کالے صاحب بہادروں کو شرم نہ آئی اور انہوں نے نہ سوچا کہ اگر ڈاڑھی سے آدمی فوجی ملازمت کا اہل نہیں ہوتا تو یہ سکھ کیسے لفٹیننٹ جنرل ہو گیا۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے مسلمان افسر صاحبان ڈاڑھی والوں کو ملازمت میں نہ لینے، یا ڈاڑھی منڈوانے کو ملازمت کے لیے شرط قرار دینے کے لیے جتنے بہانے بناتے ہیں وہ سب بالکل لغو اور بیہودہ ہیں۔ اصل بات یہ نہیں ہے کہ ڈاڑھی رکھنے سے فوجی ملازمت کے لیے آدمی کی اہلیت یا موزونیت میں کوئی فرق آجاتا ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ انگریز کی غلامی نے ان لوگوں کو سکھوں کی بہ نسبت بہت زیادہ گھٹیا درجے کی غلامانہ ذہنیت میں مبتلا کر دیا ہے۔ سکھوں نے بھی وہی مغربی تعلیم پائی ہے جو انہوں نے پائی ہے اور اسی انگریز کی وہ بھی نوکریاں کرتے رہے ہیں جس کی یہ کرتے رہے ہیں۔ کسی میدان میں وہ ان سے پیچھے نہیں رہے لیکن وہ آج تک بھی مغربیت زدگی کی اس ذلیل انتہا کو نہیں پہنچے کہ گورو نانک اور گورو گوبند سنگھ اور

اپنے مذہب کے دوسرے اکابر کی پیروی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں اور اسے نالائقی کا نشان سمجھیں۔ یہ شرف صرف ہمارے فرنگیت زدہ حضرات ہی کو نصیب ہوا کہ انہوں نے جب انگریز کی بندگی اختیار کی تو اپنا سب کچھ لا کر خداوند انگریز کے قدموں میں ڈال دیا۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ یہ لوگ انگریز کی نوکری حاصل کرنے کے لیے بخوشی ڈاڑھیاں مونڈنے پر راضی ہو گئے، بلکہ رفتہ رفتہ یہ اتنے بگڑے کہ انہوں نے خود ڈاڑھی کو نالائقی کا نشان تسلیم کر لیا۔ حالانکہ ڈاڑھی جس طرح سکھوں کے اکابر مذہب کی سنت تھی اسی طرح وہ مسلمانوں کے اکابرِ دین کی سنت بھی تھی، اور جس طرح سکھوں کو ان کے پیشوائے دین نے اس کو رکھنے کا حکم دیا تھا اسی طرح مسلمانوں کو بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے رکھنے کی تاکید اور مونڈنے کی ممانعت فرمائی تھی۔ اس صورتِ حال کو جب میں دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی شدت کے ساتھ یہ احساس ہوتا ہے کہ مسلمان خود اپنے ہی ہم سر اور ہم عصر غیر مسلموں کی بہ نسبت سیرت و کردار کے اعتبار سے کتنے فروتر ثابت ہوئے ہیں۔

میرا مشورہ نہ صرف آپ کو، بلکہ تمام اُن نوجوانوں کو جن کے اندر دینی غیرت و حمیت موجود ہے، یہ ہے کہ وہ اِن حالات میں پست ہمت نہ ہوں اور کوئی کمزوری نہ دکھائیں۔ ان کو چاہیے کہ ہر مقابلے کے امتحان میں شریک ہو کر اپنی قابلیت و اہلیت ثابت کر دیں اور اس کے بعد جب صرف ڈاڑھی کے سبب سے ان کو ملازمت میں لینے سے انکار کیا جائے تو ملازمت سے محرومی کو قبول کر لیں اور ڈاڑھی ہرگز نہ مونڈیں۔ اس طرح اگر غیرت مند مسلمان نوجوان پے در پے عمل کرتے رہیں گے تو انشاء اللہ یہ بات بالکل ثابت ہو جائے گی کہ ڈاڑھی رکھنے والے نااہل نہیں ہیں بلکہ ان پر ملازمتوں کے دروازے بند کرنے والے نام نہاد روشن خیال افسر انتہائی تنگ نظر "ملّا" ہیں اور وہ اپنی اسی تنگ نظری کے باعث اپنے ملک کی ملازمتوں کو مضبوط سیرت و کردار رکھنے والے نوجوانوں سے محروم کر رہے ہیں۔ ہماری حکومت اگر یہی پسند کرتی ہے کہ صرف بیٹ پرِ ضمیر و ایمان کی قربانی دینے والے ہی ملازمتوں میں رہ جائیں اور تمام ایماندار بلند کردار لوگوں پر ملازمتوں کے دروازے بند رہیں تو وہ جب تک چاہے اپنی اس تباہ کن پالیسی پر چلتی رہے۔ آخر کار اس کو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے اس حماقت سے اپنا اور ملک کا کس قدر نقصان کیا ہے۔

مطبوعات

تفسیر آیت النور | تالیف: مولانا شاہ رفیع الدین المحدث الدہلوی۔ مرتبہ: مولانا عبدالحمید الصواتی۔ شائع کردہ: مدرسہ نصرت العلوم، گوجرانوالہ، مغربی پاکستان۔ صفحات ۴۸۔ قیمت ا روپیہ ۲۵ نئے پیسے۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب سطعات میں آیت نور کی تفسیر کرتے ہوئے عالم شہادت اور عالم مجرد کے درمیان ربط و تعلق کے بارے میں نہایت ہی دقیق علمی بحث کی ہے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند شاہ رفیع الدینؒ نے زیر تبصرہ کتاب میں اُن نکات کی وضاحت فرمائی ہے جن کی طرف اُن کے والد بزرگوار نے بڑے لطیف پیرائے میں اشارہ فرمایا تھا۔ اس اعتبار سے یہ قابلِ قدر رسالہ بھی حکمت ولی اللہ کی تسہیل کے لیے کلید کا کام دے سکتا ہے۔ حضرت شاہ رفیع الدین کے بعض دوسرے رسائل کی طرح یہ رسالہ بھی نفسِ مضمون کے لحاظ سے کافی مشکل ہے اس لیے صرف اہلِ علم ہی اس سے صحیح طور پر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مدرسہ نصرت العلوم کے اربابِ اختیار خاص طور پر مولانا عبدالحمید صاحب سواتی ہدیۂ تبریک کے مستحق ہیں کہ انھوں نے شاہ رفیع الدین کی نایاب کتب کی نشر و اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اس علمی خدمت کے لیے جزائے خیر دے۔

عبوری اسلامی قانون | تالیف جناب محمد علیم صاحب جالندھری۔ شائع کردہ: بشیر پرنٹنگ پریس، جھنگ صدر۔ صفحات ۱۳۶۔ قیمت درج نہیں۔

یہ رسالہ ایک دردمند مسلمان اور تجربہ کار پولیس افسر جناب محمد علیم جالندھری کا نتیجۂ فکر ہے۔ اس میں انھوں نے بڑی دیدہ وری کے ساتھ رائج الوقت قانون کے غیر اسلامی اجزا پر تنقید کی ہے

اور علم اور تجربہ کی بنیاد پر ان کے نقائص کی وضاحت فرمائی ہے اور اس کے بعد ان غیر اسلامی اجزاء کی جگہ اسلامی اجزا بھی تجویز کیے ہیں۔ وہ اپنی ان سفارشات کو اسلامی قانون کا درجہ نہیں دیتے بلکہ اُن کا موقف یہ ہے کہ جب تک اسلامی قانون ملک میں نافذ نہیں ہوتا اس وقت تک رائج الوقت قانون کے اندر چند تبدیلیاں کر کے اسے اسلامی نقطۂ نظر سے کسی حد تک بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

ماہنامہ گلِ خنداں | مدیر اعزازی: جناب پیام شاہجہانپوری۔ پرنٹر پبلشر ملک سراج الدین کشمیری بازار، لاہور۔ چندہ سالانہ چار روپے۔

زیر نظر رسالہ گلِ خنداں کا ۱۸۵۷ء نمبر ہے۔ اس میں اُس انقلاب انگیز تحریک کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیا گیا ہے جسے انگریز غدر کے نام سے موسوم کرتا رہا ہے۔ لکھنے والوں میں سر سید احمد خاں، خواجہ حسن نظامی، مولانا غلام رسول مہر، مولانا علم الدین سالک، جناب رئیس احمد جعفری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی اور پروفیسر یوسف جمال انصاری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سر سید احمد خاں نے اسبابِ بغاوت کا ذکر کرتے ہوئے اس حقیقت کو بڑے واشگاف الفاظ میں تسلیم کیا ہے کہ اس ملک کے عوام اپنے مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کو کسی صورت بھی گوارا نہ کر سکتے تھے اور انگریز اس قسم کی حماقت کرنے کا تہیہ کر چکا تھا:

> "سب کو یقین تھا کہ ہماری گورنمنٹ علانیہ مذہب بدلنے پر مجبور نہیں کرے گی بلکہ خفیہ تدبیریں کر کے مثل نابود کر دینے علم عربی و سنسکرت اور مفلس و محتاج کر دینے ملک کے اور لوگوں کو ان کے مذہب سے ناواقف کر کے اپنے دین و مذہب کی کتابیں اور مسائل اور وعظ پھیلا کر نوکریوں کا لالچ دے کر، لوگوں کو بے دین کر دے گی ۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی بنائے گئے وہ تمام اضلاع ممالک مغربی و شمالی میں ارادہ گورنمنٹ کا ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ

ہندوستان کو اس طرح پر مفلس و محتاج کر کے اپنے مذہب میں لے آئیں گے۔

بعض صاحب رانگریز) اپنے ملازموں کو حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی پر آن کر پادری صاحب کا وعظ سنو اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ غرض کہ اس بات نے ایسی ترقی پکڑی تھی کہ کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ اس گورنمنٹ کی عمل داری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب قائم رہے گا۔"

اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد جہاں ہمیں اس برِ اعظم کے باشندوں کے مذہبی احساس کا اندازہ ہوتا ہے، وہاں ہمیں اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس ملک میں عیسائیت کن کن طریقوں سے پھیلائی گئی۔

جناب پیام شاہجہانپوری صاحب نے اس نمبر کو کافی محنت اور سلیقہ سے مرتب کیا ہے اور اس کے مندرجات اور ان کی ترتیب فاضل ایڈیٹر کے حسنِ ذوق اور تلاش کی شہادت دیتے ہیں۔ اس خاص نمبر کی قیمت دو روپے ہے۔